ماہنامہ
آنکھ مچولی
کراچی
اپریل ۱۹۹۵ء
محنت کش بچے
ایک خصوصی گوشہ
ستارے بکھیرتے یہ ننھے ننھے ہاتھ...
جیتا جاگتا فیچر
اندرونی صفحات پر...

Fruity Flavour
Bronze Shield
Toothpaste
EXTRA STRENGTH TOOTHPASTE WITH 2 FLUORIDE SYSTEM
اب برش کرنا
کیا مزے کی بات!
فروٹی فلیور ٹوتھ پیسٹ
2 فلورائیڈ سسٹم کے ساتھ
Bronze Shield
Fruity Flavour
مزیدار ذائقہ - حفاظت بھی زیادہ
Crescent C mmunications International (Pvt) Ltd.

آپ کی خوشحالی کے لیے ایک نیا منصوبہ
نیشنل بینک
ماہانہ آمدنی اسکیم
اس اسکیم میں کم از کم دس ہزار اور زیادہ سے
زیادہ جتنی رقم چاہیں جمع کرائیں اور متوقع
منافع ۱۶٫۰۳ فیصد سالانہ کے حساب سے حاصل کریں۔
جمع شدہ رقوم پر حکومت پاکستان کی ضمانت
تفصیلات کے لیے بینک کی کسی بھی شاخ سے رجوع کریں
آپ کی خدمت ہمارا افتخار
نیشنل بینک آف پاکستان
Telephones: 2417989 - 2416781 - 10 lines Ext. 405
Fax: 2421236 - Telex: 23732 NBP PK
UNITED
PID-I-32 94

اپنی روایتی آب و تاب کے ساتھ:

آنکھ مچولی کراچی کا خاص نمبر

مئی ۱۹۹۵ء میں منظر عام پر آرہا ہے

بچوں کی صحافت میں ایک گراں قدر اضافہ

پچھلے خاص نمبروں سے مختلف بھی منفرد بھی

کہانیاں، فیچر، طنز و مزاح معلوماتی مضامین، دلچسپ مقابلے، گدگداتے کارٹون،

مزیدار لطائف، آپ کی پسندیدہ شخصیات کے انٹرویو

اور وہ سب کچھ

جن کے بارے میں ابھی سے نہیں بتایا جا سکتا

رسالہ دیکھ کر آپ کہہ اُٹھیں گے

واقعی یہ پیش کش آنکھ مچولی ہی کی ہو سکتی ہے

آپ بھی لکھیے — ہر تحریر کا معاوضہ دیا جائے گا

کوئی نیا آئیڈیا — کوئی نیا خیال

"خاص نمبر" کے لیے ذہن میں آتے تو ضرور لکھیے

— اسے آپ کے حوالے سے شائع کیا جائے گا —

اپنی کاپی آج ہی بُک کرا لیجیے

تحریریں بھیجنے کا پتہ نوٹ کر لیجیے

مدیر اعزازی "آنکھ مچولی" اپی آئی بی کالونی، کراچی ۷۴۸۰۰

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

آنکھ مچولی

آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے تصدیق شدہ اشاعت
رُکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رُکن پاکستان چلڈرنز میگزین سوسائٹی

جلد نمبر ۹ شمارہ نمبر ۱۰ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ذیقعد ۱۴۱۵ھ اپریل ۱۹۹۵ء

مدیر اعلیٰ
ظفر محمود شیخ
منتظم اعلیٰ
تجمل حسین چشتی
مدیر اعزازی
طاہر مسعود
مجلس ادارت
منیر احمد راشد، محمد عمر احمد خان
مصوّر
مومن رحیم
سرکولیشن مینجر
بابر فاروقی
منیجر اشتہارات
عمران احمد

☆ ☆

قیمت
۱۵ روپے
۷ درہم ۷ ریال

○ ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی۔
○ ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔
○ ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیر سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا ہے۔

خط و کتابت کا پتہ گرین گائیڈ اکیڈمی، ۱۰۔ پی آئی بی کالونی، کراچی ۵ (۷۴۸۰۰) فون: ۴۹۴۸۲۱۰ ، ۴۹۴۲۹۵۷

ناشر: ظفر محمود شیخ ○ طابع: زاہد علی ○ مطبع لاریب پرنٹنگ پریس ایم اے جناح روڈ کراچی

تعلیم

قومی ترقی کا ایک اہم ستون!

ملک سے ناخواندگی دُور کر کے فنّی اور پیشہ ورانہ
تعلیم کو فروغ دینے کی اشد ضرورت ہے کیونکہ بامعنیٰ
تعلیم کے بغیر ترقی ناممکن ہے۔

حبیب بینک اپنی اسکول بینکنگ اسکیم، اسپانسرڈ
اسکالرشپ اور قرضِ حسنہ اسکیموں کے ذریعے
ملک میں تعلیم کے فروغ کے لئے اپنا بھرپور کردار
ادا کر رہا ہے۔

بہتر خدمت کی روایت

حبیب بینک لمیٹڈ

PIQ (Islamabad)

فہرست

سنہرے حروف ـــــ ادارہ ـــــ ۸
ماہِ رواں کی پہلی بات ـــــ اداریہ ـــــ ۹
حمد باری تعالیٰ (نظم) ـــــ انیسہ سحر بخاری ـــــ ۱۰
میں جنت کا خواہش مند ہوں ـــــ زبیر طارق ـــــ ۱۱
ستارے چمکتے رہیں گے ـــــ م - الف - راشد ـــــ ۱۶
کرنیں بکھیرتے یہ ننھے ننھے ہاتھ ـــــ فرزانہ روحی ـــــ ۲۰
عالمی میلے میں (نظم) ـــــ محمد عمر احمد خان ـــــ ۲۶
موتیے کے گجرے ـــــ حمیرا خاتون ـــــ ۲۷
دیا سلائی ـــــ سیّد مسعود حسن رضوی ادیب ـــــ ۳۰
راستہ بھول کر ـــــ عباس عالم ـــــ ۳۲
پرانی تہذیب اور متجرات ـــــ نگہت آرا چوہان ـــــ ۳۴
وزیرِ اعظم کا شکریہ ـــــ ابنِ آس ـــــ ۳۸
یہ دُنیا اپنا گھر ہے (نظم) ـــــ محمد جاوید خالد ـــــ ۴۲
سب سے بڑے مفکر ـــــ ڈاکٹر اسلم فرخی ـــــ ۴۳
ہمت کرے انسان ـــــ ریحانہ منیر ـــــ ۴۹
سویٹر کے عوض ـــــ محمد عاقل احمد خان ـــــ ۵۶
شادی کا جھگڑا (نظم) ـــــ افشاں بشیر ـــــ ۶۰
آمنے سامنے ـــــ سلیم خالق ـــــ ۶۳
عینک والا جن ـــــ محمد رافع ـــــ ۶۷
سونا کیسے دریافت ہوا؟ ـــــ ابن اے چوہان ـــــ ۷۵
سوتا جاگتا ابوالحسن ـــــ نیّر مسعود ـــــ ۷۷
ہنستے ہنستے ـــــ منتخب لطائف ـــــ ۸۳
آیا آیا بہار کا موسم (نظم) ـــــ حفیظ الرحمٰن احسن ـــــ ۸۷
بنام آنکھ مچولی ـــــ خطوں کے جواب ـــــ ۸۸
اب میں کیا کروں ـــــ ادارہ ـــــ ۹۲
امتحان آگیا (نظم) ـــــ زاہد الحسن زاہد ـــــ ۹۵
وہ کیا راز تھا ـــــ محمد عمر احمد خان ـــــ ۹۶
قلم دوست ـــــ ننھی تحریریں ـــــ ۱۰۷

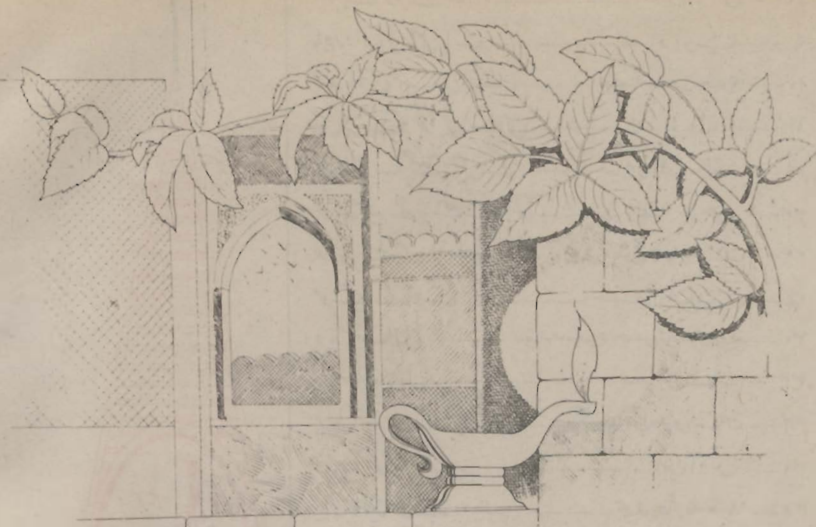

سنہرے حروف

فاتح مصر عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی فوج کے ساتھ ایک مقام پر پڑاؤ کیا۔ کچھ دنوں بعد جب پڑاؤ سے کوچ کا حکم دیا گیا تو خیمہ اکھاڑنے والے سپاہیوں نے دیکھا کہ فاتح مصر کے خیمے پر ایک کبوتری نے آشیانہ بنا کر انڈے دے رکھے ہیں۔ فاتح مصر نے فرمایا کہ کبوتری ہماری ہمسایہ ہے جب تک انڈوں سے بچے نکل کر اڑنے کے قابل نہ ہو جائیں خیمہ نہ اکھاڑا جائے اور آشیانے پر ایک محافظ مقرر فرما دیا۔ کچھ دنوں بعد جب فاتح مصر اسی جگہ واپس آئے تو اس خیمہ کے گرد ایک شہر بسا دیا گیا اور اس شہر کا نام "فسطاط" رکھا جس کے معنی خیمہ کے ہوتے ہیں۔ یہ شہر اسی نام سے مشہور رہا۔ آج کل اس کا نام قاہرہ ہے۔

پہلی بات

جب ہم کسی ورکشاپ میں کسی بچے کو گندے سندے کپڑے پہنے کام کرتے دیکھتے ہیں یا دیکھتے ہیں کہ کوئی چھوٹا سا لڑکا پھولوں کے ہار بیچ رہا ہے یا سگنل پر رکی ہوئی گاڑیوں کے شیشے صاف کرتا پھر رہا ہے تاکہ روپے دو روپے مل جائیں ------ تو بے اختیار ہمارا دل ہمدردی سے بھر آتا ہے ------ ہم سوچتے ہیں: آہ! یہ کیسا ظالم معاشرہ ہے جہاں پھول جیسے بچوں کو بھی پیٹ پالنے کے لئے محنت مزدوری کرنی پڑتی ہے ---- ارے ان بچوں کو تو اسکول کی چہار دیواری میں ہونا چاہئے۔ ان کے جسم پر تو یونیفارم ہونے چاہئیں اور ہاتھوں میں اوزار کے بجائے کتابیں ہونی چاہئیں۔ یہ اور ایسی ہی باتیں ہم دیر تک سوچتے رہتے ہیں۔ ان بچوں سے اس قسم کی ہمدردی ظاہر کرتی ہے کہ ہم بہت حساس قسم کے آدمی ہیں اور ہمارے سینے میں انسانیت کا بڑا درد ہے۔

عجیب حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ایسا ہی کوئی بچہ اسی شام ایک وقت کی روٹی کے لئے ہمارے دروازے پر دستک دیتا ہے تو ہم اسے کچھ دیئے دلائے بغیر چلتا کر دیتے ہیں یا اسی عمر کا کوئی لڑکا ہمارے گھر پر ملازم ہو جائے تو ہم اس سے سختی کے ساتھ پیش آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تھوڑے سے روپوں کے عوض یہ مشین کی طرح کام میں جُتا رہے۔ تب ہمیں ایک لمحے کے لئے خیال نہیں آتا کہ ہم تو بڑے انسان دوست ہیں اور اس قسم کے بچوں سے بڑی ہمدردی ظاہر کرتے رہے ہیں۔ آخر اس بات کا کیا مطلب ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ محنت کش بچوں سے زبانی کلامی ہمدردی کرنا بھی اب ایک فیشن بن گیا ہے۔ حالانکہ ان بچوں کو ہماری اس طرح کی نمائشی ہمدردی کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہم ان پر ترس کھا کر ان کے محنت و مشقت کے جذبے کی توہین کرتے ہیں جس کا ہمیں کوئی حق نہیں۔

دیکھا جائے تو محنت کش بچے ہماری محبت کے مستحق ہیں یہ اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کی عزت کی جائے ---- اور جب ان بچوں سے محبت کی جائے گی اور ان سے عزت سے پیش آیا جائے گا تو انہیں خود بخود معاشرے میں وہ مقام مل جائے گا جو انہیں ملنا چاہئے۔

جس دن ان بچوں کے متعلق ہمارا رویّہ بدل گیا، محنت کش بچوں کی قسمت بھی بدل جائے گی۔

آپ کا دوست   طاہر مسعود

حمد باری تعالیٰ

انیسہ سحر انصاری

تو غفور الرّحیم ہے مولا
تیری ہستی عظیم ہے مولا
خالقِ کائنات ہے تو ہی
رونقِ شش جہات ہے تو ہی
نور ہے تیرا چاند تاروں میں
نکہتیں ہیں تیری بہاروں میں
بحر و بر پر تیری حکومت ہے
فرض سب پر تیری عبادت ہے
تو نعیم و کریم ہے مولا
تو غفور الرّحیم ہے مولا
بحرِ غم سے نکالنے والا
تُو ہے دنیا کو پالنے والا
حکم سے تیرے دن نکلتا ہے
راستہ آفتاب چلتا ہے
رات آتی ہے لے کے نام ترا
وقت کرتا ہے احترام ترا
چیر کر دل دِکھائیں اب کس کو
حال اپنا سُنائیں اب کس کو
تجھ کو پروردگار کہتے ہیں
مونس و غم گُسار کہتے ہیں
کر سحر پر نگاہِ لُطف و کرم
دل ہے اور دل کے واسطے ہے غم
تو خبیر و علیم ہے مولا
تو غفور الرّحیم ہے مولا

میں جنّت کا خواہشمند ہوں

تحریر : ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت پاشا
ترجمہ : زبیر طارق

عمرو بن الجموح قبیلہ بنو سلمہ کے سردار اور یثرب کے قائدین میں سے تھے۔ ان کا شمار انتہائی سخی افراد میں ہوتا تھا۔

زمانہ جاہلیت میں یہ روایت تھی کہ معزز افراد گھر میں ایک بت رکھا کرتے تھے۔ وہ صبح و شام اس سے تبرک لیتے، تہواروں پر اس کے لئے قربانی کی نذریں چڑھاتے اور مصائب میں اس سے پناہ طلب کرتے۔ عمرو بن الجموح کے بت کا نام منات تھا۔ وہ نہایت عمدہ لکڑی سے بنایا گیا تھا۔ عمرو اس کی خوب دیکھ بھال کرتے اور اسے عمدہ خوشبوؤں میں بسائے رکھتے۔

حضرت مصعب بن عمیر اسلام کی دعوت پھیلانے یثرب پہنچے تو عمرو بن الجموح زندگی کی ساٹھ بہاریں گزار چکے تھے۔ حضرت مصعبؓ کے ذریعے یثرب کے گھروں میں ایمان کی کرنیں تیزی سے پھیلنے لگیں۔ عمرو بن الجموح کے بیٹوں معوذ، معاذ اور خلاد نے اپنے ہم عمر دوست معاذ بن

جبل کے ہمراہ ایمان کی دولت پالی۔ بیٹوں کے بعد ان کی اہلیہ ہند بھی ایمان لے آئیں مگر عمرو بن الجموح کو ان تمام واقعات کی کچھ خبر نہ تھی۔

ان کی اہلیہ دیکھ رہی تھیں کہ یثرب کی اکثریت نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ یہاں کے باعزت سرداروں میں ان کے خاوند عمرو بن الجموح اور چند دیگر افراد ہی شرک پر باقی رہ گئے ہیں۔ ہندؓ کے دل میں اپنے شوہر کے لئے بے پناہ محبت اور عزت تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ انہیں کفر کی حالت میں موت آئے اور وہ آگ میں جا پڑیں۔

عمرو بن الجموح کے دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کی بہت بڑی تعداد نے اپنا دین چھوڑ کر محمدؐ کے دین کی پیروی اختیار کر لی ہے۔ انہیں خوف تھا کہیں ان کے بیٹے بھی مصعب بن عمیر کا کہا مان کر اپنے باپ دادا کا دین نہ چھوڑ بیٹھیں۔ چنانچہ ایک دن انہوں نے اپنی اہلیہ سے کہا:

"ہند! جب تک ہم کوئی رائے قائم نہیں کر لیتے، تم چوکنا رہا کرو۔ تمہارے بیٹے اس شخص (مصعب بن عمیر) سے نہ ملتے رہیں۔"

"آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ مگر کیا آپ نے وہ کلام سنا جو آپ کا بیٹا اس شخص سے سن کر آیا ہے۔" ان کی اہلیہ نے کہا۔

"تمہارا بُرا ہو۔ کیا معاذ بے دین ہو گیا ہے اور مجھے خبر تک نہیں؟ عمرو بھڑک اٹھے۔

"نہیں، ایسا نہیں، وہ اس داعی کی کسی مجلس میں گیا تھا اور وہاں سے کچھ یاد کر آیا ہے۔" اس صالحہ خاتون کو اپنے بوڑھے خاوند پر رحم آ گیا۔

"اسے میرے پاس بلاؤ۔" عمرو نے اپنی اہلیہ سے کہا۔ معاذؓ اپنے والد کے پاس آئے تو انہوں نے کہا، "یہ شخص جو کچھ کہتا ہے اس میں سے مجھے بھی کوئی چیز سناؤ۔"

معاذؓ نے انہیں سورۃ الفاتحہ سنائی: "اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام کائنات کا رب ہے۔ نہایت مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔ روز جزا کا مالک ہے۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا، جو معتوب نہیں ہوئے، جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں۔"

"کیا ہی دلنشین اور عمدہ کلام ہے۔" عمرو نے یہ آیات سن کر کہا۔ "کیا اس کا سارا کلام اسی طرح ہے؟" انہوں نے بیٹے سے پوچھا۔

"جی ابو! اسی طرح خوبصورت اور عمدہ ہے۔ کیا آپ اس کی پیروی کریں گے؟ آپ کی پوری قوم تو اس پر ایمان لے آئی ہے۔"

بوڑھے عمرو کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر بولے:

"میں منات سے مشورہ کئے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ دیکھو وہ کیا کہتا ہے۔"

"ابو! منات شاید ہی کچھ کہے۔ وہ تو لکڑی کی بنی ہوئی بہری، بے عقل اور بے زبان چیز ہے۔" بیٹے نے کہا۔ بوڑھا باپ یہ سن کر گرم ہو گیا: "میں نے کہہ دیا میں اس کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں

کروں گا۔"

اس کے بعد عمرو بن الجموح منات کی جانب چل کھڑے ہوئے۔ منات سے ان کے سوال و جواب کی صورت یہ تھی کہ پردے کے پیچھے ایک بوڑھی عورت کھڑی ہوتی اور وہ منات کی جانب سے جواب دیا کرتی۔ طویل القامت عمرو منات کے سامنے اپنی ایک ٹانگ کے سہارے کھڑے ہوگئے کیونکہ ان کی دوسری ٹانگ میں شدید لنگ تھا۔ انہوں نے منات کی تعریف و توصیف کے بعد کہا:

اے منات! یقیناً تمہیں علم ہوگا۔ مکہ سے آنے والا یہ داعی تمہاری برائی کے سوا کچھ نہیں چاہتا۔ وہ یہاں اس لئے آیا ہے کہ ہمیں تیری عبادت سے روک دے۔ میں اس کا پُرتاثیر کلام سن چکا ہوں لیکن تیرے مشورے کے بغیر مجھے اس کی پیروی پسند نہیں۔ میں چاہتا ہوں تم مجھے مشورہ دو۔"

مگر منات کی جانب سے کوئی جواب نہ آیا۔ (حضرت ہندؓ نے بوڑھی عورت کو وہاں سے بھگا دیا تھا) وہ بولے:

"شاید تم خفا ہوگئے...... میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے تم کو تکلیف پہنچے کوئی بات نہیں۔ جب تک تمہاری ناراضگی دور نہیں ہوتی، میں انتظار کر لیتا ہوں......"

عمرو بن الجموح کے بیٹے اس بات سے اچھی طرح آگاہ تھے کہ ان کے والد منات کے ساتھ بے پناہ عقیدت رکھتے ہیں اور اس پر ایک زمانہ گزر چکا ہے۔ تاہم وہ یہ بات جان گئے کہ ان کے دل میں منات کی قدر و منزلت کی بنیادیں ہل گئی ہیں۔ اب اپنے والد کو ایمان کی جانب لانے کا سارا دارومدار انہی پر تھا۔ باپ کے دل میں قائم شرک کی عمارت ان کو ہی ڈھانا تھی۔ اس کے لئے انہوں نے ایک دلچسپ منصوبہ بنایا۔

عمرو بن الجموح کے بیٹے اپنے دوست معاذ بن جبل کے ہمراہ رات کے وقت منات کے پاس آئے اور اسے اٹھا کر بنی سلمہ کے اسی گڑھے میں پھینک دیا جہاں کوڑا کرکٹ اور گندگی کے ڈھیر پڑے ہوتے تھے۔ اس کے بعد وہ چپکے سے واپس گھروں کو لوٹ آئے۔

صبح ہوئی، عمرو اپنی عادت کے مطابق بت کو سلام کرنے گئے مگر اسے وہاں موجود نہ پایا۔ بے اختیار بولے: "تمہارا ستیاناس ہو، رات کس نے ہمارے معبود پر ظلم کیا؟" مگر کسی نے انہیں کوئی جواب نہ دیا۔ انہوں نے اسے گھر کے اندر اور باہر ہر جگہ تلاش کیا۔ غصے کے مارے ان کا برا حال تھا۔ وہ بت اٹھانے والے کو دھمکیاں دے رہے تھے اور ساتھ ساتھ اس کی تلاش میں مصروف تھے۔ اچانک انہوں نے اسے گڑھے میں اوندھے گرا پایا۔ وہ اسے اٹھا کر گھر لائے، نہلایا، پاک کیا اور خوشبو لگا کر واپس اس کی جگہ پر رکھ دیا اور کہا:

"بخدا اگر مجھے علم ہوتا کہ یہ حرکت کس نے کی ہے میں اس کی ضرور خبر لیتا۔"

دوسری رات آئی نوجوان دوستوں نے منات پر دھاوا بول دیا۔ اگلی صبح بوڑھے عمرو نے اسے دوبارہ

گڑھے کے اندر گندگی سے لتھڑا ہوا پایا۔ وہ اسے دوبارہ اٹھالائے، غسل دیا، خوشبولگائی اور اس کی جگہ رکھ دیا۔

نوجوان بت کے ساتھ ہر رات یہی سلوک دہرانے لگے۔ عمرو بالآخر تنگ آ گئے۔ ایک رات سونے سے پہلے وہ اس کے پاس آئے۔ انہوں نے اپنی تلوار اس کے گلے میں لٹکائی اور کہا.

"منات. واللہ میں یہ بات نہیں جان سکا کہ تیرے ساتھ کون شخص یہ گستاخی کرتا ہے۔ میں یہ تلوار تیرے پاس چھوڑے جارہا ہوں۔ اب اگر تجھ میں کوئی بھلائی ہے تو خود ہی اپنی حفاظت کرے"

اتنا کہہ کر وہ اپنے بستر پر آ گئے۔

بوڑھے عمرو گہری نیند سو گئے تو نوجوان بت کے پاس آئے۔ تلوار کو اس کے گردن سے اتارا، بت اٹھایا اور گھر سے باہر جاکر ایک کتے کی لاش کے ساتھ اسے باندھ دیا۔ پھر انہوں نے ان دونوں کو بنی سلمہ کے پرانے کنویں میں موجود گندگی کے ڈھیر پر پھینک دیا۔

بوڑھے عمرو کی آنکھ کھلی تو بت حسب معمول غائب تھا۔ وہ اس کی تلاش میں نکلے اور بالآخر اسے کنویں میں اوندھے منہ گرا پایا۔ کتے کی لاش اس کے ساتھ بندھی ہوئی تھی اور تلوار کو اس سے چھین لیا گیا تھا۔ اس مرتبہ انہوں نے بت گڑھے سے نہیں نکالا۔ انہیں ساری بات سمجھ آ گئی اور ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ انہوں نے اسے اس کے حال پر چھوڑا اور یہ کہہ کر چل دیئے:

"واللہ! اگر تو واقعی الٰہ ہوتا تو، تو اور کتا کنویں کے اندر ایک رسی کے ساتھ نہ بندھے ہوتے۔" پھر انہوں نے کلمہ پڑھا اور اللہ کے دین میں داخل ہو گئے۔

ایمان کی حلاوت چکھنے کے بعد عمروؓ کو زندگی کے ان لمحات پر نہایت ندامت ہوئی جو انہوں نے شرک میں گزارے تھے۔ انہوں نے نئے دین کو اپنے جسم و روح کے ساتھ قبول کیا اور اس کے بعد اپنے نفس، مال اور اولاد کو اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت میں وقف کر دیا۔

شب و روز گزرتے گئے اور اُحد کا معرکہ درپیش آ گیا۔ عمروؓ نے دیکھا ان کے تینوں بیٹے اللہ کے دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو رہے ہیں۔ وہ جنگل کے شیر کے مانند صبح و شام آجا رہے تھے۔ اللہ کی رضا پانے اور شہادت حاصل کرنے کا اشتیاق ان کے چہروں سے جھلک رہا تھا۔ بیٹوں کی یہ کیفیت دیکھ کر عمروؓ کو بھی جوش آ گیا اور انہوں نے ان کے ساتھ جہاد پر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ بیٹوں کو ان کے ارادے کا علم ہوا تو انہوں نے والد کو روکنا چاہا۔ عمروؓ عمر رسیدہ اور ضعیف تھے اور پھر اس کے ساتھ انہیں شدید لنگ بھی تھا۔ معذور شخص کا عذر اللہ کے ہاں قابل قبول ہے۔ چنانچہ انہوں نے باپ سے کہا.

"ابو! اللہ آپ کا عذر جانتا ہے۔ پھر آپ وہ تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں، جس سے اللہ نے معاف کر رکھا ہے۔" ان کی یہ بات سن کر بوڑھے عمروؓ کو شدید غصہ آیا۔ وہ نبی علیہ السلام کے پاس پہنچے اور ان سے

شکوہ بیان کیا:
"اے اللہ کے نبی! میرے یہ بیٹے مجھے اس نیکی سے روکنا چاہتے ہیں۔ انکی دلیل یہ ہے کہ میں لنگڑا ہوں۔ واللہ مجھے امید ہے کہ میں پاؤں گھسیٹتا ہوا جنت میں پہنچ جاؤں گا۔"

ان کی یہ خواہش دیکھ کر اللہ کے رسول ﷺ نے ان کے بیٹوں سے فرمایا: "انہیں مت روکو، شاید اللہ نے ان کی قسمت میں شہادت لکھ رکھی ہے۔"

روانگی کا وقت قریب آیا۔ عمروؓ نے اپنی اہلیہ کو الوداع کہا۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ ان کا ہم سفر ایک طویل سفر پر جا رہا ہے جہاں سے واپسی ممکن نہیں۔ پھر انہوں نے قبلہ کی جانب رخ موڑا، اپنے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کئے اور دعا کی:

"اے اللہ! مجھے شہادت نصیب فرما اور مجھے ناکام گھر واپس نہ لانا۔"

اس کے بعد وہ میدان جنگ کو روانہ ہوئے۔ ان کے تینوں بیٹے ان کے قبیلے بنو سلمہ کی ایک جماعت ان کے ہمراہ تھی۔

میدان کارزار خوب گرم تھا مگر مسلمانوں کی غلطی کے باعث جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور لوگوں میں انتشار پھیل گیا۔ اس وقت عمروؓ بن الجموح کو لڑنے والی جماعت میں سب سے آگے دیکھا گیا۔ وہ اپنی تندرست ٹانگ پر کودتے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کی زبان پر یہ الفاظ تھے: "میں جنت کا خواہشمند ہوں......" ان کے پیچھے ان کے بیٹے خلاد تھے۔ باپ بیٹا دونوں نے نہایت بہادری کا مظاہرہ کیا اور بالآخر ایک ساتھ شہید ہو کر گرے۔

جنگ ختم ہو چکی تھی۔ نبی علیہ السلام شہدا کی لاشوں کو دفن کروا رہے تھے۔ آپؐ نے صحابہ کرام سے فرمایا: "انہیں خون اور زخموں کے ساتھ رہنے دو میں ان پر گواہ ہوں۔" پھر فرمایا: "جس مسلمان کو اللہ کی راہ میں زخم لگتا ہے۔ قیامت کے دن وہ اٹھے گا تو اس کا خون بہہ رہا ہو گا۔ جس کا رنگ زعفران کا اور خوشبو مشک کی سی ہو گی۔" اس کے بعد آپ نے ہدایت کی: "عمرو بن الجموح کو (ان کے برادر نسبتی) عبداللہ بن عمرو کے ساتھ دفن کیا جائے۔ وہ دونوں اس دنیا میں ایک دوسرے سے شدید محبت رکھتے تھے۔"

اقوال زریں

عورتوں کو سونے کی سرخی اور زعفران کی زردی نے ہلاک کر دیا ہے۔

(حضرت ابو بکر صدیق)

○ تمہارے پاس دشمن کا قاصد آئے تو اس کی عزت کرو۔

(حضرت ابو بکر صدیقؓ)

○ شرم مردوں کے لئے خوب اور عورتوں کے لئے خوب تر ہے۔

(حضرت ابو بکر صدیقؓ)

○ ظالم کو معاف نہ کرو کیونکہ یہ مظلوموں پر ظلم کرنا ہے۔

(حضرت عمرؓ)

مرسلہ: قرۃ العین اصغر (۹)

ستارے چمکتے رہیں گے

م۔ الف راشد

مجھے بچوں سے پیار ہے۔ بچے ہوتے ہی پیار کے قابل ہیں۔ معصوم بھولے بھالے چہرے، روشن آنکھیں، نازک بدن --- جیسے بیلے کی کلیاں --- جیسے موم کی گڑیا۔ ہاتھ لگے تو میلے ہوں۔ چھولیں تو پگھل جائے۔ اور ننھے ننھے دل اس سے بھی زیادہ نازک۔ ذرا غصے سے دیکھا، تھر تھر کانپنے لگے۔ زور سے ڈانٹا، فوراً" آنسو نکل آئے --- اور بچوں کو مارنا --- توبہ توبہ --

ع لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام

لیکن اس کارگہ شیشہ گری میں لگتا ہے کہ کچھ بچے پتھر سے بنے ہوتے ہیں۔ آپ نے بھی دیکھے ہوں گے --- میں بھی جب انہیں دیکھتا ہوں۔ -- دل غم سے بھر جاتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے گاڑیوں کے شیشے صاف کرتے ہوئے بچے، دوڑ دوڑ کر بسوں میں پانی پلاتے ہوئے بچے، خون میں ڈوبی ہوئی سرخیوں والے اخبار بیچتے ہوئے بچے، ہاتھوں میں ٹافیوں کے پیکٹ، پھولوں کے گجرے اٹھائے ہوئے، ننگے پیر، سر کو جھکائے، کندھے پر میلا سا تھیلا ڈالے کچرا چنتے ہوئے، ہوٹلوں میں برتن دھوتے اور میزیں صاف کرتے، ورکشاپ پر ڈیزل اور گریس میں شرابور، استاد کی جھڑکیاں اور تھپڑ کھاتے ہوئے، قالین کی کھڈیوں پر بیگار کرتے ہوئے، زری کے کارخانوں میں ستارے ٹانکتے ہوئے یا بھٹوں پر اینٹیں ڈھوتے ہوئے بچے --- یہ سب بچے موم کی گڑیا نہیں ہوتے، یہ پتھر کے مجسمے ہوتے ہیں۔ لیکن کیا ان کے دل بھی پتھر کے ہوتے ہیں ---؟ شاید نہیں ---

میں جب بھی کسی ایسے بچے کو دیکھتا تو ایک کہانی میرے ذہن میں تخلیق پانے لگتی۔ "راجو محنت کش بچہ تھا۔ اس کا باپ فوت ہو چکا تھا۔ ماں ٹی بی کی مریض تھی --- چھوٹے چھوٹے بہن بھائی تھے۔ راجو کا دل چاہتا تھا کہ وہ پڑھے۔ اچھے اچھے کپڑے پہن کر اسکول جائے۔ کھیلے کودے مگر ---" میں جب بھی اس طرح سوچتا تو مجھے وہ ہزاروں کہانیاں یاد آجاتیں جو اس موضوع پر میں پڑھ چکا تھا اور جس کا انجام کسی نہ کسی طرح بچے کی موت یا معذوری یا مظلومی ہوتا تھا۔ محنت کش بچوں کے حوالے سے کہانی لکھنا بھی ضروری تھا کہ یہ میرے فرائضِ منصبی کا حصہ ہے۔ لیکن کیا لکھوں --- کچھ ایسا جو پہلے نہ

لکھا گیا ہو، کوئی نیا آئیڈیا ---- آئیڈیئے آئے بھی مگر کہانی میں نہ ڈھل سکے۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ بالآخر ایک دن میں نے کیمرے میں رول اور لبوں پر ہمدردی کے بول سجائے اور آفس سے نکل کھڑا ہوا۔ سبزی منڈی قریب ہی تھی ---- سب سے پہلے یہاں گیا۔ بچے کمر پر ٹوکریاں لادے سامان، منڈی سے کاروں کی ڈگی میں منتقل کر رہے تھے۔ بہت سے دوسرے بچے کچرا چننے میں مصروف تھے۔ گندے سندے کپڑے ---- میلے کچیلے چہرے ---- سیاہ چیکٹ ہاتھ پاؤں، کچرے کے ڈھیر پر بیٹھے کچرے کا حصہ معلوم ہو رہے تھے۔ میں انہیں دیکھتا ہوا، گھومتا پھرتا ایک رو سے دوسری رو میں جاتا رہا۔ ایک جگہ رش کچھ کم تھا۔ چند بچے بیٹھے مرچوں میں سے کچرا صاف کر رہے تھے۔ میں ان کے قریب بیٹھ گیا۔ باتیں شروع ہوئیں۔ گل خان، نیک محمد، نور احمد ---- سب راجو تھے۔ مرچوں سے ان کی آنکھیں اور ہاتھ جلتے تو گھر کا چولہا جلتا تھا۔ میں وہاں سے باہر آگیا۔ ٹوکری لادے ہوئے ہر بچہ دراصل اپنی خواہشوں اور خاندان کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھا۔ سب ایک جیسی کہانیاں، میں روڈ کراس کر کے دوسری طرف آگیا ---- ہوٹل کا کاکا اور "استاد" کا چھوٹے ---- سب راجو تھے۔ میں طارق روڈ کی طرف نکل گیا ---- چمچماتی گاڑیاں۔ زرق برق لباس، شیشوں والی دکانیں اور مہنگے مہنگے کپڑے، میک اپ اور زیور سے لدی عورتیں اور صاف ستھرے صحت مند بچے ---- سبزی منڈی سے طارق روڈ تک سڑک کا تین کلو میٹر اور اسٹیٹس کا تین صدیوں کا فاصلہ ہے۔ میری موٹر سائیکل آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی اور ذہن تیزی سے اس تضاد پر سوچ رہا تھا۔ تضاد جو کائنات کے خمیر میں شامل ہے۔ خیر اور شر، حسن و قبح ظالم و مظلوم ---- امیر و غریب ---- ہر ایک، ایک دوسرے کی پہچان ہے ---- طارق روڈ کے اس گلشن میں پھولوں کے ساتھ ساتھ کانٹے بھی تھے۔ مانگنے والے بچے ---- کاریں صاف کرنے والے بچے۔ کاغذ اور کترنیں چننے والے بچے ---- چلتے چلتے ایک کانٹے نے میرا دامن بھی تھام لیا ---- ایک بارہ چودہ برس کا بچہ تھا ---- "پپو چاٹ کارنر" کا مالک۔ مزے دار چاٹ کے چٹخارے لیتے ہوئے میں نے پپو سے پوچھا:

"کتنے بہن بھائی ہو؟"

"آٹھ!" "اچھا!! ---- تم سب سے بڑے ہو؟"

"جی!"

باتوں سے اندازہ ہوا ---- وہ بھی راجو تھا۔

میں فوٹو گرافی کرتا، شہر کے مختلف علاقوں میں چکراتا پھر رہا تھا۔ دھوپ اور بھوک کی وجہ سے اب تو مجھے بھی چکر آنے لگے تھے۔ گھوم گھوم کر پہیئے بھی شاید تھک چکے تھے۔ ایک موڑ پر اچانک پچھلے پہیئے کی ہمت جواب دے گئی۔ پھس ... سس ....س .... شاید پنکچر ہو گیا تھا۔ میں نے گاڑی روکی...... نظر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ تھوڑے فاصلے پر پنکچر کی دکان موجود تھی ---بائیک کو گھسیٹتا ہوا وہاں تک لے گیا۔ چراغ کے جن کی طرح فوراً ایک "کاکا" حاضر ہو گیا ٹائر اتارتے ہوئے بچے سے میں نے پوچھا۔

"پڑھتے ہو؟"

"جی چھوڑ دیا۔" تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

"کیوں --- کہاں تک پڑھا؟" "چھٹی تک۔"

"کتنے بہن بھائی ہو؟" "چار۔"

"چوتھی روٹی نہیں پچتی ہوگی؟" میں نے ٹی وی کے اشتہار کو ذہن میں لاتے ہوئے کہا۔ بچہ سمجھ دار تھا۔ اشارہ سمجھ گیا۔

"جی نہیں --- صرف کھانے کے لئے تو جانور جیتے ہیں --- میں تو اپنے بھائی کو پڑھانے کے لئے مزدوری کرتا ہوں --- میں اسے بابو بناؤں گا۔" بہت عرصہ بیتا --- شاید بیس سال --- یہ جملہ میں نے سنا تھا۔

"میں اپنے بھائی کو بابو بناؤں گا۔" یہ میرے بڑے بھائی تھے --- صغیر احمد --- جنہوں نے چھٹی جماعت سے پڑھنا چھوڑ کر سائیکل کی دکان پر مزدوری شروع کر دی تھی --- وہ اتنے چھوٹے تھے کہ ٹائر میں ہوا بھرنے کے لئے انہیں پمپ کے اوپر لٹکنا پڑتا تھا --- وہ ہوا بھرتے، پنکچر لگاتے --- سائیکلیں مرمت کرتے رہے --- میں پڑھتا رہا۔ ان کے ہاتھ اور کپڑے میلے ہوتے --- میں بن ٹھن کر اسکول جاتا --- وقت پر لگا کر اڑتا رہا --- آج میں منیر احمد راشد ایم اے گولڈ میڈلسٹ معاون مدیر ماہنامہ آنکھ مچولی ہوں، گلشن اقبال کے مہنگے فلیٹ میں رہتا ہوں اور صغیر بھائی پنکچر لگاتے ہیں۔ میں نے نظر اٹھا کر سامنے دیکھا --- بچہ کام ختم کر چکا تھا۔ اس کے چہرے پر اعتماد اور آنکھوں میں امید کے ستارے روشن تھے۔ مجھے یقین تھا یہ ستارے چمکتے رہیں گے۔ میں آگے بڑھا اور بے اختیار اس کے میلے ہاتھوں کو چوم لیا --- صغیر بھائی --- میں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ بچہ حیران تھا۔ میں اسے حیرت زدہ چھوڑ کر روانہ ہو گیا۔ میرا رخ محمود آباد کی طرف تھا جہاں صغیر بھائی کا گھر اور سائیکلوں کی چھوٹی سی دکان ہے --- مجھے احساس ہوا کہ میں پچھلے دو ماہ سے ان کے گھر نہیں جا سکا تھا!!

قائد اعظم کا فرمان
کام، کام اور کام

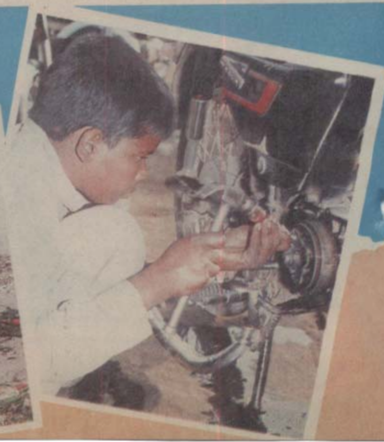

تحریر :
عکاسی : شادمان مجید

کرنیں بکھیرتے یہ ننھے ننھے ہاتھ

آپ نے اپنی امی کو جگ مگ جگ مگ کرتی ساڑی پہنے دیکھا ہوگا -
آپ کی باجی کے پاس ستاروں کی طرح جھلملاتا دوپٹہ ہوگا۔

آپ نے دلہنوں کو رنگ برنگے سلمی ستاروں سے مزین غرارہ پہنے ضرور دیکھا ہوگا۔

لیکن شاید ہی آپ کو علم ہو کہ جھلملاتی ساڑیوں، جگ مگاتے غراروں، چمچماتی قمیضوں اور کرنیں بکھیرتے آنچلوں کے پیچھے بے شمار ننھے ہنرمندوں کا فن ہوتا ہے۔ ان سنہریں دوپٹوں، ساڑیوں، اور غراروں کو ہاتھ میں لے کر قریب سے دیکھیں تو آپ کو ہرگز یقین نہیں آئے گا کہ مہارت اور صفائی سے کیا گیا یہ باریک اور نفیس کام گیارہ بارہ برس سے بھی کم عمر بچے بچیاں کر سکتے ہیں ــــ تاہم ایسا ہی ہے۔ زری کی گھریلو صنعتوں سے لاتعداد کمسن کاریگر وابستہ ہیں۔ جو کام کرنے کے ساتھ ساتھ پڑھتے بھی ہیں۔

زری کا کام ایک صاف ستھرا ہنر ہے جس میں بچوں کی عزت نفس مجروح نہیں ہوتی۔ یہاں نہ گیراج میں کام کرنے والے بچوں کی طرح جھڑکیاں سننی پڑتی ہیں۔ نہ ہوٹلوں میں جھوٹے برتن اٹھانے والے لڑکوں کی طرح "چھوٹے" کہلاتے ہیں۔ بلکہ یہاں وقت کی اہمیت کو سمجھنے اور ذہن کا بھرپور استعمال کرنے والوں کی بڑی قدر ہوتی ہے۔ زری کے کام میں وقت کی پابندی نہیں ہوتی۔ اپنی مرضی سے کہ جتنا وقت ہو کام کرو۔ زیادہ تر بچے اسکول سے آنے کے بعد کام کرتے ہیں اس طرح وہ کم از کم اپنی تعلیم کے اخراجات خود برداشت کر لیتے ہیں۔

اظہار احمد خان بیس سال سے اپنے گھر میں زری کا کام کر رہے ہیں۔ سو سے زائد بچوں کو سکھا چکے ہیں انھوں نے بتایا۔ "یہ ایک طرح سے اپنا کام ہوتا ہے۔ سیکھو اور مالک بن جاؤ۔ پانچ سو روپے میں اسکا فریم بن جاتا ہے۔ اخراجات بھی زیادہ نہیں ہیں۔ پیسہ بھی اتنا ہی ہے جتنی محنت۔"

زری کا کام کبھی بند نہیں ہوتا بلکہ سال بھر جاری رہتا ہے۔ اس لئے ہنرمند کبھی بے کار نہیں ہوتا۔ کراچی میں آتے جاتے فیشن کے لحاظ سے یہ کام کم اور زیادہ ہوتا رہتا ہے۔ مگر شادی بیاہ کے موسم میں اپنے عروج پر رہتا ہے۔ البتہ پنجاب میں رہنے والے بچوں کی امی، باجی خالائیں، چچیاں چونکہ زرق برق لباس کی زیادہ شوقین ہوتی ہیں۔ اور وہ شادی بیاہ کے علاوہ منگنی، سالگرہ، عقیقہ کی تقریبات میں بھی خوبصورت چمکیلے کپڑے پہننا زیادہ پسند کرتی ہیں۔ لہٰذا وہاں یہ کام بڑے پیمانے پر ہوتا ہے۔ اسکے ہنرمند بھی زیادہ ہیں اور اسی طرح مواقع بھی بہت ہیں۔

ریشم، موتی ستارے، دَبکے، کورا، نقشین، سلمی ستارہ، تِلّا یہ سب کام زری کے تحت ہی

آتے ہیں جن میں دو سو قسم کے میٹریل استعمال ہوتے ہیں۔ اس میں ڈیزائننگ، ایجادات و اختراعات کے بے شمار مواقع ہوتے ہیں۔ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو استعمال کر کے خوب سے خوب تر ڈیزائن بنایا جاسکتا ہے۔ جس کی زبردست مانگ ہوتی ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ یہ کام جتنا مہنگا ہوتا جارہا ہے۔ اسکے کاریگر اتنے ہی ہوتے جارہے ہیں۔ کم عمر بچوں کی ایک بڑی تعداد بہت کم اجرت کے عوض یہ کام کرتی نظر آتی ہے۔ شروع شروع میں ایک نیا بچہ دو تین ہفتوں تک سوئی چلانا سیکھتا ہے۔ زری کی سوئی کروشیہ کی سوئی جیسی پانچ چھ انچ لمبی اور نوک سے مڑی ہوئی ہوتی ہے۔ جسے ""مٹھیا"" کہتے ہیں۔ سوئی کو شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے پکڑ کر بچہ چلاتا رہتا ہے۔ جب اس عمل میں روانی ہوجاتی ہے۔ تو اس کے بعد فریم میں چاروں جانب سے دبے کپڑوں پر کام شروع کرتا ہے۔ جسے "آرکا" لگانا کہتے ہیں۔ جو سنہری تاروں کی ایک سیدھی یا زگ زیگ لکیر ہوتی ہے۔ جس ہاتھ میں سوئی ہوتی ہے وہ کپڑوں کے اوپر ہوتا ہے جبکہ دوسرا ہاتھ کپڑے کے نیچے ہوتا ہے۔ جسکے ذریعے سنہری تار یا ریشم کو وہ سوئی کی مڑی ہوئی نوک میں پھنسا کر اوپر کھینچ لیتا ہے۔ یہاں بھی کام ذہانت کا محتاج ہوتا ہے۔ دو تین ہفتے میں بچے ٹانکا لگانا سیکھ لیتے ہیں۔ اسکے بعد بقیہ کام وہ خود کرتے چلے جاتے ہیں۔

اس کام میں آنکھوں اور انگلیوں کا استعمال بہت زیادہ ہے۔ سوئی انگلی میں چبھ سکتی ہے۔ بینائی کمزور ہوسکتی ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کتاب کو مقررہ فاصلے سے بہت قریب یا بہت دور رکھ کر پڑھیں تو آنکھوں پر زور پڑتا ہے۔ اس میں بھی آنکھیں کپڑے کے بہت قریب کرلیں یا بہت دور رکھیں تو خراب اثرات مرتب ہونگے۔ جہاں توجہ ہٹی سوئی نازک انگلیوں میں گھس سکتی ہے۔ یا ٹانکا غلط لگ سکتا ہے۔

یہ ہنر سیکھنے والے بچوں کو ابتدا میں پانچ سے پندرہ روپے ہفتے کے حساب سے ملتا ہے۔ اس کے بعد مہارت کے ساتھ ساتھ کام کا حساب گھنٹوں میں ہوتا ہے جسے نفری کہتے ہیں۔ ایک نفری آٹھ گھنٹے پر مشتمل ہوتی ہے۔ اسکے باوجود بھی وقت کی پابندی ضروری نہیں ہے۔ اسکول سے واپسی کے بعد عموماً بچے دو یا چار گھنٹے کام کرتے ہیں۔ چار سال بعد ایک بچہ مکمل استاد بن جاتا ہے۔ اسکے بعد اپنے گھر میں اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ اور مالک بن جاتا ہے۔

کراچی کے ایک علاقے اورنگی ٹاؤن میں زری کے تقریباً ایک ہزار کارخانے ہیں۔ جن میں لاتعداد بچے یہ کام کررہے ہیں۔ جسکا معاوضہ انھیں اتنا نہیں مل رہا جتنی محنت، توجہ اور باریکی سے یہ کام کیا جاتا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ دکاندار جوان کپڑوں کو فروخت کرتے ہیں وہ اسکا سب سے زیادہ معاوضہ وصول کرتے ہیں۔ بعض اوقات پچاس سے پچھتّر فیصد فائدہ دکانداروں کو حاصل ہوجاتا

ہے۔ اس کام میں بچوں کو زیادہ اجرت نہیں ملتی اسکے باوجود وہ اس طرف کیوں راغب ہیں؟ اس سوال کے جواب میں زری کے ماہر محمد نعیم نےجو میٹرک کے طالب علم بھی ہیں، بتایا۔

"یہ صاف ستھرااور آسان کام ہے۔ خاص طور پر پڑھنے والے بچوں کے لئے بہت اچھا ہے اس میں آزادی ہوتی ہے۔ جتنا وقت ہے اسی حساب سے کام کرو اور معاوضہ لو میں خود فارغ اوقات میں یہ کام کر کے اپنا خرچ نکالتا ہوں۔"

زاہد تین سال سے یہ کام کررہے ہیں انکے نو بہن بھائی ہیں۔ والد آرسی کمپنی میں کام کرتے ہیں۔ انھیں آٹھ گھنٹے کام کرنے پر روزانہ ۳۵ روپے ملتے ہیں۔

○ عشرت نگہت اور دانش آپس میں بہن بھائی ہیں پڑھنے کے علاوہ یہ اپنے گھر میں زری کا کام کرتے ہیں۔ عشرت دسویں اور نصرت پانچویں جماعت کی طالبہ ہیں۔ یہ کل آٹھ بہن بھائی ہیں۔ عشرت ہفتے میں پانچ سو روپے کمالیتی ہیں۔ یہ اپنے بھائیوں کو پڑھاتی ہیں۔

○ بارہ سالہ اشفاق نے بتایاوہ ٹیوشن پڑھنے جاتا ہے اسکے والد سبزی فروش ہیں۔ وہ ہفتے میں پچاس روپے کمالیتا ہے۔

○ حامد سعید پانچویں جماعت میں زیر تعلیم ہیں۔ انکے والد پھل فروش ہیں۔ تین بھائی ایک بہن ہے جو نویں جماعت میں پڑھتی ہیں۔ حامد ہفتے میں ڈھائی سو روپے کمالیتے ہیں۔

○ چودہ سالہ نوشاد کے والد حکیم ہیں۔ یہ نویں جماعت میں سائنس گروپ کے طالب علم ہیں۔ انکے تین بھائی اور پانچ بہنیں ہیں۔ یہ تین سال سے زری کا کام کررہے ہیں۔ تین چار گھنٹے کام کر کے اپنا خرچ خود اٹھاتے ہیں۔

○ ریاض الدین عرف راجو کی عمر دس برس ہے۔ انکے والد راج مستری ہیں۔ گھر کی ایک ہی اولاد ہیں۔ یہ شوق سے کام کرتے ہیں کیونکہ انکے سارے دوست یہی کام کرتے ہیں انھیں ہفتے میں ۳۵ روپے ملتے ہیں۔

○ ۱۴سالہ منا کے والد کاانتقال ہوچکا ہے۔ چار سال سے زری کا کام کرتے ہیں۔ انکے پانچ بہن بھائی ہیں۔ ٹیوشن بھی پڑھتے ہیں۔ روزانہ پچاس روپے کمالیتے ہیں۔

○ میٹرک سائنس گروپ کے طالب علم دلشاد نے بتایا کہ وہ تین سال سے زری کا کام کررہے ہیں۔ والدصاحب جوٹ مل میں ملازم تھے جو بند ہوگئی تو والد بیکار ہوگئے۔ زری کے کام میں آزادی ہے۔ اس لئے کچھ وقت کام کر کے چند روپے کمالیتے ہیں۔

○ تیرہ سالہ راشد تین سال سے کپڑوں پر ستارے بکھیر رہے ہیں۔ انکی دو بہنیں اور دو بھائی ہیں۔ تین بہن بھائی اسکول جاتے ہیں۔ راشد خود بھی ٹیوشن پڑھتے ہیں۔ انکے والد کپڑے کی مل میں مزدوری کرتے ہیں۔ انہیں زری کے کام میں پانچ

روپے فی گھنٹے کے حساب سے معاوضہ ملتا ہے۔

○ تیرہ سالہ علی احمد تین برس سے یہ کام کررہے ہیں۔ انکے والد درزی ہیں۔ چار بہن بھائی میں یہ سب سے بڑے ہیں۔ ہفتے میں دو سو روپے کما لیتے ہیں۔ پڑھنے کا شوق ہے مگر مجبوری کی وجہ سے نہیں پڑھتے۔

○ مراد کی عمر بارہ سال ہے۔ ساتویں جماعت میں زیر تعلیم ہیں۔ دو سال سے زری کا کام کررہے ہیں۔ ہفتے میں سو روپے کما لیتے ہیں۔ انکے والد حجام کا کام کرتے ہیں۔ انکے چار بھائی اور دو بہنیں ہیں۔

○ دس سالہ وسیم انگلش میڈیم اسکول میں کلاس ون کے طالب علم ہیں۔ انکے آٹھ بہن بھائی ہیں۔ والد پولکا آئسکریم میں کام کرتے ہیں۔ وسیم اپنا خرچ خود اٹھاتے ہیں۔

○ پرویز بھی ساتویں جماعت میں پڑھتے ہیں۔ انکے چار بھائی بھی زری کا کام کر کے اپنا بوجھ خود اٹھاتے ہیں۔

○ واجد عرف کاموا پنی عمر آٹھ سال بتاتے ہیں۔ مگر یہ کسی طرح بھی آٹھ برس کے نہیں لگتے۔ اس چھوٹی سی عمر میں سو روپے ہفتہ کما لیتے ہیں۔ انکے سات بہن بھائی ہیں۔ مقصود نے بتایا کہ انکے والد واٹر بورڈ میں کام کرتے ہیں اور نشہ بھی کرتے ہیں۔ بڑے بھائی جوتے کا کام کرتے ہیں۔ اور سارے چھوٹے بہن بھائی زری کے کام سے وابستہ ہیں۔ مقصود نے بتایا کہ وہ اپنی باجی سے پڑھتے ہیں۔

○ دس سالہ جمیل ایک سال سے زری کا کام کر رہے ہیں۔ چالیس روپے ہفتہ کماتے ہیں۔ انکے چھ بہن بھائی ہیں۔ یہ ٹیوشن پڑھنے جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کھڈی پر کام کرتے ہیں۔ تیسرے جیکٹ سیتے ہیں پڑھتے نہیں ہیں۔ والد صاحب بہت بوڑھے ہیں لیکن پھر بھی ایک ہوٹل میں بیرا گیری کرتے ہیں۔

○ نو سالہ راحیل کے والد مکینک ہیں۔ راحیل نے بتایا وہ شرارتیں بہت کرتے ہیں اسی لئے والدہ نے اسے نانی کے پاس بھیج دیا۔ اور نانی نے اسے زری کے کام پر لگا دیا۔

یہ تھے وہ کمسن محنت کش جن کی بڑی تعداد حصول علم کے ساتھ ساتھ زندگی کی گاڑی کھینچنے کی جدو جہد میں مصروف ہے۔

زیادہ تر کارخانوں میں بچے اتنے چھوٹے تھے کہ ہمیں یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ انہیں کبھی سوئی نہیں چبھی ہوگی۔ مہنگائی، بے روزگاری اور مجبوری کے خوفناک عفریت نے انکے چہرے کی معصومیت چھین کر وہاں سنجیدگی کے پہرے بٹھا دیئے تھے۔ ایک کارخانے کے مالک سے ہم نے پوچھا۔ اتنے چھوٹے بچوں سے کام لیتے ہوئے آپ کو افسوس نہیں ہوتا؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم کیا کریں۔ انکے والدین خود ان بچوں کو ہمارے پاس چھوڑ جاتے ہیں۔ کہ بے کار ادھر ادھر پھرنے کی بجائے ہنر سیکھ لیں گے۔ اس میں میرا بھی فائدہ

ہے انکا بھی فائدہ ہے۔ حالانکہ یہ چھوٹے بچے سوئی مار کر کپڑا پھاڑ دیتے ہیں جسکی وجہ سے سوراخ بھرنا پڑتا ہے۔

بچوں سے بات چیت کے دوران اندازہ ہوا کہ یہ تمام بچے بے حد ذہین اور حساس ہیں۔ شرارت اور معصومیت انکی آنکھوں سے جھانک رہی تھی۔ ان سے انکی تعلیم کے بارے میں پوچھا جاتا تو پر مسرت چہروں کے ساتھ جواب دیتے۔ لیکن والد کے بارے میں بتاتے ہوئے کچھ کی نگاہیں جھک گئیں تو کچھ کے چہرے پر اداسیوں نے گھیر ڈال لیا۔ بچے نہیں چاہتے تھے کہ ہم انکے بارے میں لکھتے ہوئے یہ بھی تحریر کریں کہ انکے والد نشہ کرتے ہیں۔ یا انکے گھریلو حالات بہت خراب ہیں۔ زیادہ تر ننھے بچوں کے والد حب میں واقع جوٹ مل کی بندش کے سبب بے روزگار ہو گئے تھے۔ جسکی وجہ سے وہ کمسن بچے زری کا کام کرنے پر مجبور تھے۔

یہ بچے اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھتے ہیں۔ تقریباً ہر ایک نے اپنی عمر حقیقی سے زیادہ بتائی انکی زندگی میں کھیل کا کوئی دخل نہیں۔ یہی کام انکا کھیل ہے۔ سوئی کو کپڑے میں ڈال کر سنہری ریشے کو پھنسانا اور پھر اس میں ستارے یا موتی اٹکانے کو ہی وہ کھیل سمجھتے ہیں۔ جسکے نتیجے میں انہیں چند روپے اور کپڑوں کو جھلملاہٹ مل جاتی ہے۔

لیکن کیا یہ چند روپے کرنیں بکھیرتے ننھے ہاتھوں کے مستقبل کو تابناکی عطا کر سکتے ہیں؟ اس سوال کا جواب کون دے گا!

عالمی میلے میں

محمد عمر احمد خان

بچّوں کا تھا عالمی میلہ جس میں مجھ کو جانا تھا
"بچّوں کا دل کیا چاہتا ہے" سب کو یہ سمجھانا تھا
کار میں بیٹھا روڈ پہ پہنچا گاڑی کھڑ کھڑ کرتی تھی
اس کے پلگ میں کچرا تھا اور مجھ کو بھی کچھ جلدی تھی
پہنچا ایک گیراج پہ فوراً کھٹ سے گاڑی سے اُترا
جھٹ سے اپنا ہاتھ ہلایا فٹ سے ایک بندہ آیا
میں نے سُنائی رام کہانی گاڑی کی بیماری کی
میری بات سُنی جو اس نے رِقّت خود پہ طاری کی
چھوٹے سے لڑکے کو بُلایا کھول دی اس نے گاڑی خود
پانا اس کے ہاتھ میں دے کر لینے گیا ترکاری خود
ویسے تو میلا سا گندے ہاتھوں والا بچّہ تھا
لیکن بالکل پھولوں جیسا بھولا بھالا بچّہ تھا
گاڑی میں اُلجھا تھا لیکن آنکھیں خوب جھپکتا تھا
چُپکے چُپکے میری جانب جانے کیا وہ تکتا تھا
گاڑی جونہی ٹھیک ہوئی میں پیسے دے کر بیٹھ گیا
لیکن بچّے کے چہرے پر ایک سوال سا لکھا تھا
جیسے پوچھ رہا ہو مجھ سے "کب تک میں یہ کام کروں
دیکھیں! میں بھی چاہتا ہوں نا روشن اپنا نام کروں
بات تو اس کی ٹھیک تھی لیکن مجھ کو جلدی جانا تھا
"بچّوں کا دل کیا چاہتا ہے" سب کو یہ سمجھانا تھا

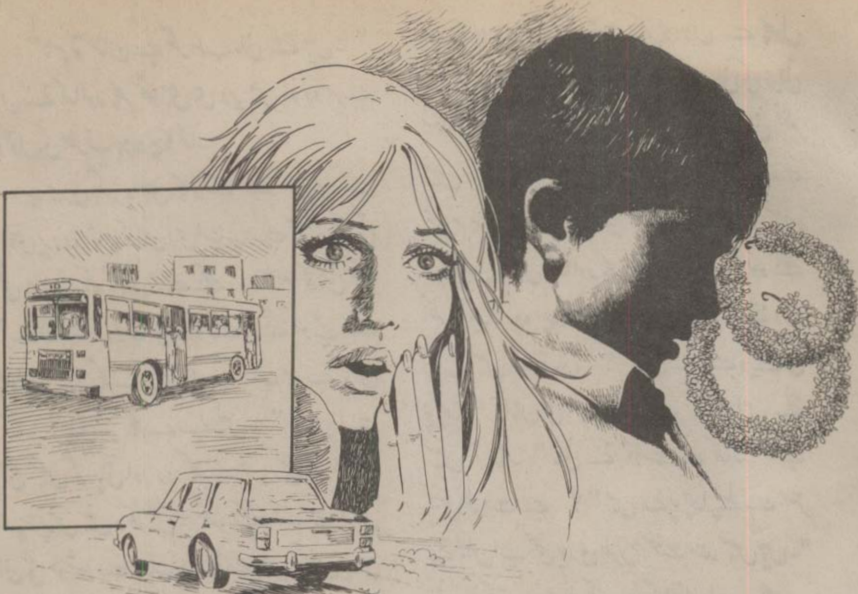

موتیے کے گجرے

حمیرا خاتون

"باجی۔ گجرے لے لیں۔" معصوم سی آواز پر میں نے مڑ کر دیکھا۔ میرے پیچھے ایک بارہ تیرہ سال کا خوبصورت بچہ کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں موتیا کے ادھ کھلے پھولوں اور کلیوں کے خوبصورت گجرے تھے جن کی خوشبو ارد گرد کی فضا میں پھیل رہی تھی اور موتیے کے خوبصورت پھولوں اور ان کی خوشبو کی تو میں شروع ہی سے دیوانی تھی۔ میں ان پھولوں کو بڑی حفاظت سے سنبھال کر رکھتی۔ اس لئے اس وقت بھی ان تازہ کھلے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر میں اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکی اور دو گجرے خرید لئے۔ "بہت بہت شکریہ۔ باجی آپ کا۔" بچے نے بڑی تشکر آمیز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ لگ رہا تھا شاید میں ہی اس کی پہلی گاہک ہوں۔ ایسے ہی بے اختیار بچے کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے پوچھ لیا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"

"نام تو عثمان ہے مگر سب مانی کہتے ہیں۔" اس نے کہا اور پھر تھوڑی ہی دیر میں وہ دوسرے لوگوں کی طرف بڑھ چکا تھا۔

یہ میری گھر واپسی کا وقت تھا۔ سروس سے واپسی پر روز شام کو میں اسی اسٹاپ سے گاڑی پکڑتی تھی۔ اب کچھ دنوں سے مجھے روز شام کو مانی نظر آنے لگا تھا جو روزانہ ہی تازہ کھلے ہوئے موتیے کے پھولوں کے گجرے بیچتا تھا۔ وہ جب میرے پاس آتا۔ "باجی۔ گجرے لے لیں۔" تو میں اسے منع نہیں کر پاتی اور دو گجرے خرید لیتی اور انہیں اپنے پرس میں رکھ لیتی۔ گھر پہنچنے تک میرا پرس ان کی خوشبو سے مہک جاتا تھا پھر میں انہیں پرس سے نکال کر حفاظت کے ساتھ اپنی کتابوں اور ڈائری میں رکھ لیا کرتی۔ اس طرح میری کتابیں اور ڈائریاں ہمیشہ موتیے کی خوشبو سے مہکتی رہتیں۔ اور میں جب بھی انہیں کھولتی، یہ خوشبو میرے ارد گرد پھیل جاتی اور میں آنکھیں بند کر کے گہری گہری سانسیں لے کر اس خوشبو کو اپنے اندر اتار لیتی۔ اس طرح میرا تھکا ہوا وجود تازہ ہو جاتا تھا۔

میں اب مانی کی مستقل گاہک بن چکی تھی۔ مانی ایک خوبصورت بچہ تھا۔ اس کی تین بہنیں تھیں اور وہ ایک ہی بھائی تھا۔ ابو کا انتقال ہو چکا تھا اور اب اس کی امی اور بہنیں گھر میں سلائی کر کے گزارہ کر رہی تھیں۔ مانی بھی صبح سے گارمنٹس کے ایک کارخانے میں بیٹھا کرتا اور پھر دوپہر کو اسکول جاتا۔ شام میں گجرے بیچتا جو اس کی بہنیں گھر میں لگے ہوئے بڑے سے موتیے کے پودوں سے پھول چن کر بنا دیتیں۔ یہ سب باتیں مجھے مانی کی زبانی معلوم ہوئیں۔ پھر کافی دن گزر گئے۔ مانی نظر نہیں آیا۔ میرا پرس اب موتیے کی خوشبو سے محروم ہو چکا تھا۔ مجھے مانی کا انتظار تھا۔ پتہ نہیں اب کیوں نہیں آتا اور پھر ایک دن شام کو وہ مجھے نظر آ گیا۔ وہ سیدھا میرے پاس آیا۔ "اتنے دن کیوں نہیں آئے مانی ؟" میں نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ "اماں کی طبیعت خراب تھی۔ اس لئے نہیں آ سکا۔" مانی نے آہستہ سے کہا۔ "اب کیسی طبیعت ہے ؟" میں نے پوچھا "پہلے سے بہتر ہے لیکن اب بھی پوری طرح صحت مند نہیں ہیں۔" مانی نے کہا۔ وہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اور ___ پھر دوسرے دن میں امی سے اجازت لے کر واپسی میں مانی کے ساتھ قریب ہی اس کے گھر گئی اس کی اماں کا حال پوچھنے۔ چھوٹا سا صاف ستھرا گھر۔ ایک کونے میں بہت سارے پودے لگے تھے جن میں موتیا کا بہت بڑا جھاڑ بھی تھا جس میں ڈھیر سارے موتیے کے پھول لگے تھے۔ مانی کی بہنیں اور ماں بہت خوش ہوئیں۔ تین بہنیں۔ مانی اور ان کی اماں۔ یہ سب آپس میں ہی مل کر زندگی کے دکھ سکھ کو گزار رہے تھے۔ میں کچھ دیر وہاں بیٹھی ان کی خلوص بھری باتوں کو سنتی رہی اور ان میں موجود خلوص کو اپنے اندر اتارتی رہی کہ خلوص اب بہت نایاب ہوتا جا رہا ہے۔

اور پھر ایک دن میں نے دیکھا کہ مانی اب

اسٹاپ پر کھڑی گاڑیوں میں چڑھ کر گجرے بیچنے لگا ہے۔ مجھے گاڑیوں سے بہت ڈر لگتا ہے اور پھر ہمارے یہاں کے ڈرائیور حضرات چلاتے بھی اس طرح ہیں کہ کسی کا خیال نہیں کرتے اور مانی تو ابھی بچہ تھا۔ بار بار گاڑیوں میں چڑھنا' اترنا— میرا دل ڈرنے لگا۔ میں نے اسے منع کیا تو وہ کہنے لگا۔

"باجی۔ یہاں اسٹاپ پر تو کم ہی لوگ خریدتے ہیں۔ گاڑی میں چڑھنے سے میرے سارے گجرے بہت جلدی بک جاتے ہیں۔" پھر بھی وہ میرے لئے ضرور دو گجرے بچالیتا اور واپسی پر ٹھیک اسی وقت وہ اسٹاپ پر موجود ہوتا۔ ایک دن مجھے مانی نظر نہیں آیا۔ حالانکہ وہ روزانہ واپسی پر ضرور میرے لئے وہاں رکا کرتا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ مگر مانی کا کچھ پتا نہ تھا، اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد میری بس آگئی۔ میں اس میں بیٹھ گئی۔ بس چلنے میں ابھی دیر تھی کہ میں نے کھڑکی سے دیکھا مانی سڑک کے دوسری طرف کھڑی ایک بس میں گجرے بیچ رہا تھا۔ بس آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ مانی نے جلدی سے بس سے اترنا چاہا مگر بس تیز ہو چکی تھی۔ مانی کو ایک جھٹکا لگا اس کے ہاتھ سے ڈنڈا چھوٹ گیا اور وہ بس سے گر گیا اور پیچھے سے آتی تیز رفتار گاڑی نے اسے کوئی مہلت نہ دی۔

"مانی۔" میں بے اختیار چیخی۔ میرے سامنے ہی مانی کا خوبصورت جسم پڑا تھا جس میں سے سرخ سرخ خون نکل کر موتیے کے سفید پھولوں کو

رنگ برنگی لکیریں

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جیٹ طیارہ اپنے پیچھے ایک لمبی سفید یا رنگ برنگی لکیریں ضرور چھوڑ جاتا ہے۔ یہ بخاراتی لکیریں ہوتی ہیں یہ لکیریں اس وقت نمودار ہوتی ہیں جب طیارہ اپنی مقرر کردہ صحیح رفتار سے پرواز کر رہا ہو اور دوسری ضروری بات یہ کہ ہوا میں نمی کی مناسب مقدار بھی موجود ہو۔ ہوا میں ہر وقت نمی کی کچھ نہ کچھ مقدار ضرور موجود ہوتی ہے۔ بخاراتی لکیریں ہوا کہ ایک خاص بھنور میں جیٹ طیارے کے پروں کے پیچھے بنتی ہیں یہ ہوائی بھنور وقت کے ساتھ ساتھ پھیلاؤ کی صورت اختیار کرتا جاتا ہے اور ساتھ ہی ٹھنڈا بھی ہوجاتا ہے ایک دم سے ٹھنڈا ہو جانے سے نمی کے یہ چھوٹے چھوٹے ذرے آپس میں چمٹ جاتے ہیں پھر چمٹ کر یکجا ہونے کی صورت میں بادل بن جاتے ہیں۔

اور یوں ہمیں رنگ برنگی سفید لال کالی اور سبز لکیریں بادل کی صورت میں دکھائی دیتی ہیں۔

مرسلہ: خرم طارق، جگنو، گوجرانوالہ۔

سرخ کر رہا تھا۔ یہ وہی دو گجرے تھے جو اس نے میرے لئے بچائے تھے۔

اس دن سے آج تک میں موتیے کے خوبصورت گجرے کبھی نہیں خرید سکی۔ جب بھی لینا چاہا بے اختیار مانی یاد آجاتا اور پھر مجھے ایسا لگتا جیسے موتیے کے خوبصورت سفید پھول مانی کے خون سے سرخ ہوتے جارہے ہیں سرخ سرخ موتیے کے پھولوں کے گجرے۔

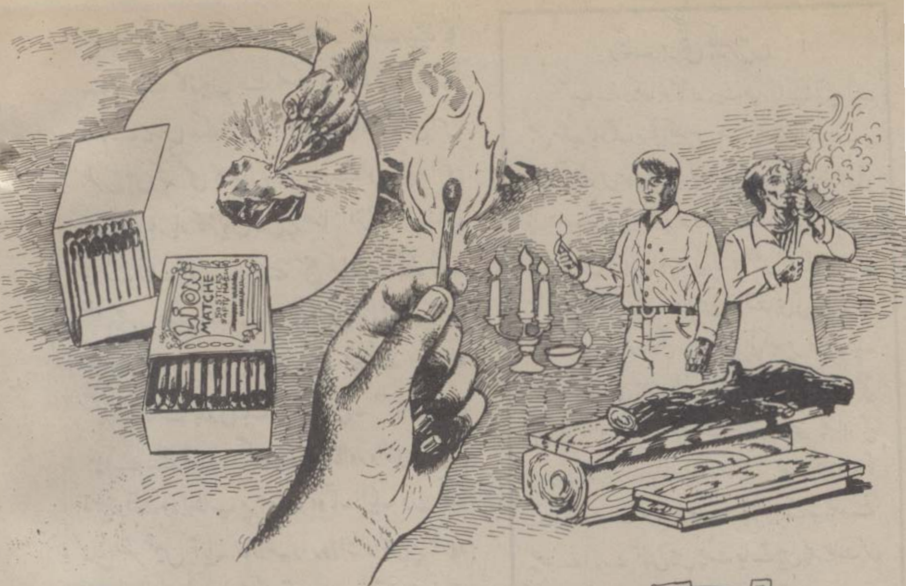

دیاسلائی

سیّد مسعود حسن رضوی ادیب

یہ مضمون آج سے ۱۰۰ سال پہلے لکھا گیا۔

تم نے اکثر دیکھا ہو گا کہ رات کو جب اِکے گاڑیاں پکی سڑکوں پر چلتی ہیں تو گھوڑے کا قدم زمین پر پڑنے کے ساتھ کبھی کبھی چنگاریاں اڑنے لگتی ہیں۔ تم نے کبھی غور بھی کیا کہ اس کا سبب کیا ہے؟ بات یہ ہے کہ پتھر اور لوہے کے ٹکرانے سے آگ پیدا ہو جاتی ہے۔ گھوڑوں کے سموں میں لوہے کے نعل لگے ہوتے ہیں۔ یہ نعل جب پتھریلی سڑک پر پڑتے ہیں تو چنگاریاں اڑنے لگتی ہیں۔

پرانے زمانے میں دیاسلائی کا نام بھی کوئی نہیں جانتا تھا، اس لئے چراغ روشن کرنے اور آگ جلانے کا یہ طریقہ تھا کہ چقماق پتھر کا ایک ٹکڑا لے کر اس پر لوہے کی ایک کیل مارتے تھے۔ اس سے چنگاریاں پیدا ہوتی تھیں۔ ان چنگاریوں کو کسی کپڑے یا روئی پر گرا لیتے تھے اور منہ سے پھونک پھونک کر آنچ اٹھاتے تھے۔ آنچ سے چراغ روشن کر لیتے تھے۔ اب تم نے دیکھا کہ ایک چراغ جلانے کے لئے کتنی چیزوں کی ضرورت ہوتی تھی اور کتنا جھگڑا کرنا پڑتا تھا۔

دیاسلائی بن جانے سے اب بڑی آسانی ہو گئی ہے۔ ڈبیا سے ایک دیاسلائی نکال کر کھینچی اور

آگ جلالی۔ اب ان کاموں میں کچھ بھی دیر نہیں لگتی۔

آج کل سگریٹ اور بیڑی پینے کا مرض بہت پھیل گیا ہے۔ مگر اچھے لڑکے اب بھی ان چیزوں سے دور بھاگتے ہیں۔ ان سگریٹ اور بیڑی پینے والوں کی وجہ سے دیا سلائی کا خرچ بہت بڑھ گیا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں ایک کروڑ اسی لاکھ گرُوس دیا سلائیاں صرف برصغیر میں باہر سے آئی تھیں۔ ایک گرُوس بارہ درجن کا ہوتا ہے۔ اب ذرا حساب لگا کر دیکھو کہ فقط ایک سال میں ہندوستان میں کتنی دیا سلائیاں خرچ ہوئیں۔ یہ بھی یاد رکھو کہ اس حساب میں وہ دیا سلائیاں شامل نہیں ہیں جو ہندوستان میں بنی تھیں۔ یہ تو صرف ایک ملک کا خرچ ہے۔ اگر دنیا کے سب ملکوں کا حساب جوڑا جائے تو نہ معلوم کہاں تک پہنچے۔

دیا سلائی کو دیکھو تو ایک چھوٹا سا پتلا پتلا لکڑی کی ٹکڑا ہوتا ہے جس کے ایک سرے پر ذرا سا کالا کالا مسالا لگا ہوتا ہے۔ مگر تم کو کیا خبر کہ یہ چھوٹی چھوٹی دیا سلائیاں بنانے کے لئے جنگل کٹوائے جاتے ہیں اور ہزاروں من مسالا تیار کروایا جاتا ہے۔

دیا سلائی بنانے کے کارخانے میں بہت سی مشینیں یا کلیں ہوتی ہیں۔ کوئی مشین لکڑی کے بڑے بڑے لٹھوں میں سے پتلے پتلے تختے تراشتی ہے۔ کوئی ان تختوں کو کاٹ کر پتلی پتلی چھڑیاں سی بناتی ہے۔ کوئی انہیں چھڑیوں کو دیا سلائی کی لمبائی کے برابر کاٹ کر لاکھوں ٹکڑے کر دیتی ہے۔ کوئی ان ٹکڑوں کا سرا مسالے میں ڈبو کر خشک کرتی ہے۔

ایک طرف دیا سلائیاں بن رہی ہیں، دوسری طرف دیا سلائی کی ڈبیاں بنانے والی کلیں اپنا کام کر رہی ہیں۔ کوئی لکڑی کے باریک باریک ورق اتار رہی ہے۔ کوئی ڈبیا کی ناپ کے موافق ان کے ٹکڑے کر رہی ہے۔ کوئی ان ٹکڑوں کو جوڑ جوڑ کر ڈبیاں بنا رہی ہے۔ کوئی ان ڈبیوں پر کاغذ مُنڈھ رہی ہے۔

جب دیا سلائی اور ڈبیا بن چکتی ہیں تو دیا سلائیوں کو ڈبیوں میں بھرنا ہوتا ہے اور بارہ بارہ ڈبیوں کا ایک ایک بنڈل اور بارہ بارہ بنڈلوں کو ایک بڑا بنڈل بنانا ہوتا ہے اور ان بنڈلوں کو لکڑی کے صندوق میں بند کرنا ہوتا ہے۔ یہ سب کام بھی مشینوں ہی سے کئے جاتے ہیں۔

آدمی نے اپنی عقل سے کیسی کیسی کلیں ایجاد کر دیں کہ جو کام ہزاروں آدمی مل کر برسوں میں بھی نہیں کر سکتے وہ ایک مشین دن بھر میں کر ڈالتی ہے۔ اگر آدمی اپنے ہاتھ سے دیا سلائی بناتے ہوتے تو دیا سلائیوں کی ریل پیل نہ ہوتی اور پیسے کی ایک دیا سلائی بھی مشکل سے ملتی۔

پہلے دیا سلائیاں ہمیشہ دوسرے ملکوں سے آیا کرتی تھیں۔ مگر چند سال سے ہندوستان میں بھی دیا سلائی بنانے کے کارخانے کھل گئے ہیں۔ سب سے اچھے برما میں ہیں۔

راستہ بھول کر

عباس عالم

وہ تتلی راستہ بھول کر سڑک پر آگئی تھی۔ اس کا سارا بچپن تو باغ میں گذرا تھا۔ ہنستے کھیلتے۔ جہاں ہرے بھرے پودے تھے اور رنگ برنگے پھول۔ شام کو بچے کھیلنے آتے تو باغ کی رونق ذرا اور بڑھ جاتی لیکن تتلی کے لئے مشکلات بڑھ جاتیں کیونکہ بچے اس کو پکڑنے کی کوشش کرتے۔

"یہ بچے آخر مجھے پکڑنے کی کوشش کیوں کرتے ہیں؟" وہ پریشان ہو کر سوچتی اور سوچتی رہ جاتی لیکن کچھ سمجھ نہ آتا۔ ہرے بھرے پتوں کے درمیان چھپ کر وہ خود کو خاصا محفوظ خیال کرتی اور وہاں سے چپکے چپکے باغ کا منظر دیکھتی رہتی جہاں بچے بھاگ دوڑ رہے ہوتے اور سارا باغ ان کی ہنسی کی آوازوں سے گونج رہا ہوتا۔

ایک دن ابھی وہ چھپنے کی لئے تیار نہ ہو سکی تھی کہ اچانک ایک موٹا سا بچہ اس کی جانب بہت تیزی سے لپکا۔ وہ گھبرا کر اڑی اور بس بغیر ادھر ادھر دیکھے اڑتی ہی چلی گئی۔ بچے نے ذرا دور تو اس کا تعاقب کیا پھر نہ جانے کہاں نکل گیا۔ تب تتلی نے ذرا سانس لیا اور آس پاس دیکھا۔ "لیکن ارے یہ کیا" اس نے دیکھا وہ تو سڑک پر آگئی تھی۔ باغ تو بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اب تو ہر طرف دھواں ہی دھواں تھا شور ہی شور تھا۔ گاڑیوں کے ہارن تیزی سے بج رہے تھے اور ساتھ ساتھ لوگ بھی چیخ چلا رہے تھے۔ عجیب افراتفری تھی۔

"کیا کروں؟" اس نے سوچا۔ "یہاں تو آس پاس کوئی پودا بھی نہیں ہے جہاں چھپا جا سکے کسی نے پکڑنے کی کوشش کی تو کیا ہو گا؟"

سامنے ایک دکان تھی جہاں موٹر سائیکلیں ٹھیک کی جا رہی تھی اور شور کچھ زیادہ ہی ہو رہا تھا۔ اس کے برابر میں ایک کتابوں کی دکان تھی۔ یہاں خاموشی تھی۔ بچے دکان میں ادھر ادھر کھڑے کتابیں دیکھ رہے تھے۔

"اس دھوئیں سے تو بچنا چاہئے ورنہ پر بھی کالے ہو جائیں گے۔پھر کیا پتا میں اڑ بھی نہ پاؤں۔" اس نے فیصلہ کیااور دکان میں داخل ہوگئی جہاں کتابوں کے صفحے الٹتے ہوئے بچوں کو اس کے آنے کا بالکل بھی پتانہ چل پایا۔

تتلی چپکے سے ایک اونچے بک شیلف پر بیٹھ گئی اور وہاں سے نیچے کا منظر دیکھنے لگی۔ اس بک شیلف کے بالکل نیچے کہانیوں کی بڑی بڑی رنگین کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ جن پر مختلف جانور اور پرندے وغیرہ بنے ہوئے تھے۔

اچانک اس کی نظر بالکل دائیں جانب رکھی ہوئی کتاب پر پڑی۔ اس کتاب پر ایک بڑی سی رنگین تتلی بنی ہوئی تھی اور ایک بچہ اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ بچے کے ہاتھ میں ایک بڑا ساجال تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ تتلی کو پکڑ کر ہی دم لے گا۔

تتلی حیران رہ گئی۔ اس نے شکر ادا کیا کہ جس باغ میں وہ رہتی تھی وہاں بچوں کے پاس اس طرح کے خوفناک جال نہیں۔ "ورنہ تو؟" وہ سوچ کر ہی کانپ گئی۔

اس نے جلدی سے کتاب پر سے نظریں ہٹا لیں۔ شام کا وقت ہو رہا تھااور دکان بند ہو رہی تھی۔ دکان دار نے دھیرے سے دکان کاایک شٹر گرایا۔ دکان میں موجود بچے جلدی جلدی باہر نکلنے لگے۔ تتلی سمجھ گئی کہ اگر یہاں اور رکی تو دکان میں بند ہو کر رہ جائے گی۔ وہ فوراً باہر نکل آئی۔

باہر پھر وہی دھواں تھا۔ شور اور ہنگامہ۔ "کیا کروں؟" اس نے پریشان ہو کر سوچا۔ اچانک اس کو سامنے وہی موٹا سا بچہ نظر آیا جس نے صبح اس کو راستہ بھٹکا کر سڑک پر آنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"ارے یہ شاید باغ جا رہا ہو گا۔" اس کے پیچھے پیچھے چپکے چپکے اڑتی ہوئی تتلی واقعی باغ پہنچ گئی۔

اندر جاتے ہی اس نے فوراً اپنا مخصوص ٹھکانہ تلاش کیا۔ یہ ایک گلاب کا پودا تھا جو آم کے کٹے ہوئے درخت کے نیچے لگا ہوا تھا۔ بچے اس طرف کم آتے تھے۔ وہاں چھپ کر تتلی نے دوبارہ اسی موٹے سے بچے کو دیکھنا شروع کیا۔

بچے کے کندھے پر اسکول کا بستہ لٹکا ہوا تھا۔ اس نے بستہ کندھے سے اتارا اسے کھولا۔ پھر اس میں سے ایک چیز نکالی۔ شروع میں تو تتلی سمجھ ہی نہ پائی کہ بچے نے کیا نکالا ہے۔

پھر اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ بچے کے ہاتھ میں وہی جال تھا تتلیاں پکڑنے کا جال جو اس نے کہانی کی کتاب میں دیکھا تھا۔

تتلی گلاب کے پودے کے پتوں میں اندر ہی اندر گھستی چلی گئی۔ اس کوشش میں چند کانٹے بھی اس کے پروں میں چبھ گئے لیکن اس نے پروا نہ کی۔ وہ پودے کی شاخوں کے اتنے اندر آگئی کہ اس باغ کا منظر بھی نظر آنا بند ہو گیا۔

یہاں تتلی کا دم گھٹا جا رہا تھا لیکن اور کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور شاید رونے لگی۔ اب باغ بھی سڑک کی طرح ہو گیا تھا۔ غیر محفوظ۔ ■

پرانی تہذیب اور متحجرات

نگہت آرا، چوہان

گزشتہ دو اور تین ہزار ملین سال قبل حیات کی مختلف شکلیں یعنی پودے اور جانور جو کرۂ ارض پر موجود تھے اب ناپید ہو چکے ہیں۔ اب ہم ان کے متعلق صرف فوسلز یعنی متحجرات کے مطالعے سے معلوم کر سکتے ہیں۔ فوسل دراصل قدیم جانوروں اور پودوں کی وہ اشکال ہیں جو منجمد ہو کر پتھر بن گئے ہیں۔ پودوں اور جانوروں کے بہت سے متحجرات چٹانوں میں محفوظ ہیں۔ ان متحجرات کی مختلف شکلیں ہیں کبھی تو یہ شیل، ہڈیوں، خول اور جانوروں کے دیگر سخت حصوں کی صورت میں ملتی ہیں۔ کیمیکل کے استعمال سے یہ سخت تہہ اتر جاتی ہے۔ جانوروں کے قدموں کے نشانات بھی فوسل بن جاتے ہیں۔

متحجرات انسان کے تاریخ کے عمل سے

سینکڑوں ہزاروں سال پہلے سے بنے ہیں تاہم اس بات کی شہادتیں ملی ہیں کہ قدیم انسان نے یہ متحجرات دیکھے تھے اور وہ ان کو خاص اہمیت دیتا تھا۔ تیس ہزار سال قبل مرنے والی ایک عورت کے ڈھانچے سے ایک نیکلس ملا ہے جو سمندری گھونگوں کے متحجرات سے بنایا گیا تھا۔ قدیم یونان اور روم کے عالموں نے بھی پہاڑوں پر سمندری گھونگوں کے فوسل دریافت کئے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ سمندر میں رہنے والے جانوروں کی باقیات ہیں چنانچہ انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ پرانے زمانے میں یہ پہاڑیاں سمندر کے نیچے تھیں۔

سائنس دانوں نے سترھویں صدی کے اواخر میں متحجرات کا مطالعہ شروع کیا۔ سب سے پہلے یہ مطالعہ فرانسیسی ماہر طبیعات بیرن جارجس نے کیا۔ اس نے پیرس کے نزدیک دریا کے کنارے کی چٹانوں میں ہاتھیوں کی ہڈیاں اور ہیپوپوٹامس کے باقیات دیکھے اور ایسے بہت سے جانوروں کے فوسل جو اس علاقے میں نہیں پائے جاتے۔ اس نے اندازہ لگایا کہ کسی زمانے میں پیرس کی آب و ہوا بالکل مختلف ہوگی اور ہندوستان اور افریقہ کے موسم سے ملتی جلتی ہوگی۔ پھر ایک انگریز ویلیم اسمتھ نے انگلینڈ میں فوسل کا مطالعہ شروع کیا۔ اس نے دریافت کیا کہ ہر قسم کی چٹان میں متحجرات کا الگ نمونہ موجود ہے۔ پرانی چٹانوں میں نئی چٹانوں کی نسبت زیادہ سادہ فوسل تھے۔ اس کی مدد سے اس نے چٹانوں کی عمر کا اندازہ لگایا۔ بعد میں چارلس ڈارون نے انہی فوسلز کی مدد سے یہ شہادتیں پیش کیں کہ کس طرح زندہ اجسام نے اپنی اپنی شکلیں تبدیل کیں اور سادہ سے پیچیدہ شکل اختیار کی۔

اب ہم انسانی تہذیب کی طرف آتے ہیں۔ مہذب دور تک آنے میں انسان کو بڑا لمبا عرصہ لگا۔ پہلے وہ جانوروں کی طرح وحشیانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کی کوئی زبان نہیں تھی اور وہ جو کچھ مل جائے کھا جاتا تھا بعد میں اس نے خاندان کی بنیاد رکھی اور آگ کے استعمال سے واقف ہوا اور اس کے بھی بعد اس نے آلات بنائے اور خوراک کے لئے شکار کرنے لگا۔ اس نے برتن ایجاد کئے تاکہ اپنا کھانا پکا سکے اس نے قبیلوں کی صورت میں رہنا شروع کیا اور نئے نئے علاقوں میں نقل مکانی کے قابل ہوا۔ انسان کے ارتقا کے اگلے مرحلے میں اس نے خوراک اگانا اور مویشی پالنا سیکھا پھر اس نے دھاتوں کا استعمال سیکھا مثلاً تانبا اور لوہا تاکہ بہتر ہتھیار بنا سکے۔ اس نے مکانات بھی بنانے شروع کر دیئے اور جب اس نے تصویر بنانا سیکھی تو تہذیب کا آغاز ہو گیا۔

تحریر کی ایجاد کو تہذیب کا آغاز سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس کی مدد سے انسان نے گزرے ہوئے واقعات کا ریکارڈ رکھنا شروع کیا اور لوگ دوسروں کے تجربوں سے سیکھنے لگے۔ یہ تقریباً پانچ یا چھ ہزار سال پرانی بات ہے۔

اس مرحلے پر انسان نے اور بھی ترقی کی اس نے زراعت اور صنعت کو اس حد تک ترقی دی کہ

لوگ شہروں اور دیہات میں تقسیم ہو گئے۔ چنانچہ پھر حکومت، تجارت، قوانین اور ہجرتیں عمل میں آئیں۔ ابتدائی قدیم تہذیبیں جن کا تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے۔ مصر اور بابل کی تھیں مصریوں نے ساڑھے چار ہزار سال قبل تحریر ایجاد کر لی تھیں۔ انہوں نے حکومت تشکیل دی اور حساب کتاب وضع کیا۔ ان کا اپنا کیلنڈر تھا، معمار تھے اور وہ مختلف مشینوں کے استعمال سے آگاہ تھے۔

چار ہزار سال قبل کریٹ کے جزیرے پر بھی ایک تہذیب موجود تھی۔ اور سویری لوگ جو دریائے دجلہ اور فرات کے کنارے رہتے تھے، ساڑھے چار ہزار سال قبل ان کی بھی ایک تہذیب تھی۔ سویری بڑے جفاکش، ذہین اور ہنر مند لوگ تھے۔ یہ لوگ گائے بیل، بھیڑ اور بکریاں پالتے تھے۔ ان کی خوراک کھجور اور جو کی روٹی تھی۔ ان کے ہلوں میں ایک نلکی لگی ہوتی تھی تاکہ جتائی اور بوائی ایک ساتھ ہو جائے۔

اس کے علاوہ ہمارے پاکستان میں سندھ کے علاقے میں پانچ ہزار سال قبل ایک ترقی یافتہ تہذیب موجود تھی جس کے آثار موہنجو دڑو میں ملتے ہیں۔ یہاں کے لوگ کپڑا بننا، زراعت، تجارت، صنعت اور جہاز رانی سے واقف تھے۔ موہنجو دڑو کی ٹاؤن پلاننگ دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ یہ لوگ خوبصورت زیورات، کھلونے، سنگ تراشی، کے فن میں کمال رکھتے تھے۔ عمارتوں کی تعمیر میں بھی ان کا ذوق اور فنکاری آج بھی دیکھنے والوں کو حیران کر دیتی ہے۔ موہنجو دڑو کے علاوہ پاکستان میں ہڑپہ، ٹیکسلا، تخت بھائی وغیرہ میں قدیم تہذیبوں کے آثار ملتے ہیں۔

زمین کا خاتمہ کب اور کس طرح ہو گا؟

سائنس دانوں نے حساب لگایا ہے کہ زمین کی گردش کی رفتار میں مسلسل کمی واقع ہو رہی ہے۔ چنانچہ اس حساب سے اگر برابر کمی ہوتی رہی تو ایک وقت آئے گا جب زمین کی رفتار بالکل ختم ہو جائے گی اور نتیجے کے طور پر یا تو کھنچی ہوئی واپس سورج میں چلی جائے گی یا پھر دور خلا میں تیرتی ہوئی کسی عظیم سیارے سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گی۔ اگر یہ دونوں صورتیں نہ ہوئیں تو زمین کی اپنی گردش رک جانے کے باعث نہ صرف سورج کے گرد اسی طرح چکر لگانے کے لئے رہ جائے گی۔ جس طرح چاند ہماری زمین کے گرد چکر لگاتا رہتا ہے اور یوں زمین کا ایک نصف ہمیشہ سورج کی طرف رہے گا اور دوسرا نصف ہمیشہ سورج سے اوجھل رہے گا۔ اس کے نتیجے میں سورج کے سامنے والے حصے پر اس شدت کی گرمی پڑے گی کہ سب کچھ جل کر راکھ ہو جائے گا اور الٹی طرف اتنی شدید سردی اور اندھیرا ہو گا کہ ہر شے کا وجود ختم ہو جائے گا اور کچھ بھی زندہ نہ رہ سکے گا۔ زمین کا یہ انجام ابھی بہت دور ہے۔ اس انجام تک پہنچنے کے لئے کروڑوں بلکہ اربوں سال لگیں گے۔ کیونکہ زمین کی محوری گردش میں ایک لاکھ پچاس ہزار (۱۵۰،۰۰۰) سال میں صرف ایک سیکنڈ کی کمی واقع ہوتی ہے۔ مرسلہ: عبدالستار خان طاہر، بوریوالہ

خالد خلیل

اپنے جیسے سے ملئے

یہ ڈریکولا کا ماڈل روبوٹ یونیورسل اسٹوڈیو کے لئے بنایا گیا ہے۔

AVG کا بنایا ہوا عظیم شاہکار البرٹ آئن اسٹائن کا روبوٹ ماڈل

یہ ہیں مسٹر ٹیک! ایک روبوٹ کیریکٹر

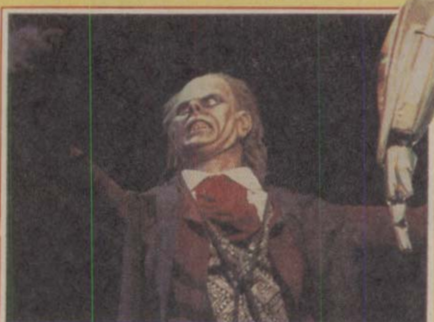

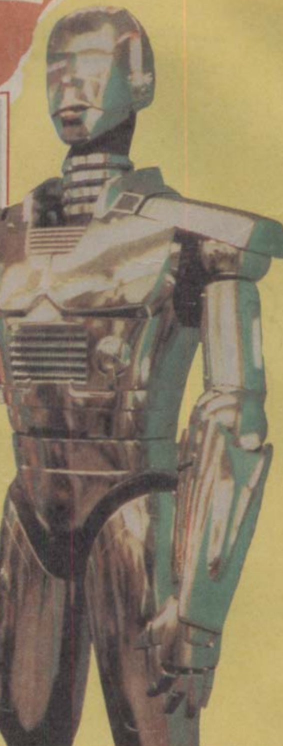

آپ مانیں یا نہ مانیں مگر یہ حقیقت ہے کہ اب آپ کا ہم شکل اور ہم آواز روبوٹ تیار ہو سکتا ہے۔ یہ دعویٰ کیلیفورنیا کی ایک کمپنی نے کیا ہے جو فلموں اور عام گھریلو زندگی کے لئے روبوٹ تیار کرتی ہے۔ اور اس کمپنی نے جس کا نام AVG ہے اپنے دعوے کو حقیقت کا روپ بھی دیا ہے۔ AVG نے انتہائی جدید ٹیکنالوجی استعمال کرتے ہوئے چند روبوٹ تیار کیے ہیں جو مختلف انداز میں حرکت کر سکتے ہیں عام انسان کی مانند چل پھر سکتے ہیں مسکرا سکتے ہیں اور آنکھوں کو جھپکا بھی سکتے ہیں۔ AVG نے ایک تین سروں والا ڈریگن کا ماڈل بھی تیار کیا ہے جو روبوٹ سازی کی تاریخ کا سب سے بڑا ماڈل ہے۔ اس روبوٹ ڈریگن میں بھی جدید آلات کا استعمال کیا گیا ہے جن کی مدد سے ڈریگن کے منہ سے آگ اور دھواں خارج کیا جا سکتا ہے۔ ان روبوٹ ماڈلوں میں ایک ماڈل مشہور سائنسدان البرٹ آئن اسٹائن کا بھی ہے۔

کمپنی نے اب تک یہ تمام خصوصی روبوٹ ماڈل فلمی دنیا کے لئے تیار کیے تھے لیکن اب AVG نے عام پیشکش کی ہے کہ وہ آپ کا ہم شکل اور ہم آواز روبوٹ بھی تیار کر سکتے ہیں جو بالکل آپ کی آواز میں اور آپ کے انداز میں بولے گا بلکہ آپ کے کپڑے پہن کر آپ کے دوستوں کو پریشان بھی کر سکتا ہے۔

وزیراعظم کا شکریہ

ابنِ آس

راشد کی پنڈلی کا درد شدت اختیار کرتا جارہا تھا۔ وہ بار بار جھک کر اپنے ہاتھوں سے اپنی پنڈلی دباتا اور پھر دوسرے بچوں کی طرح سیدھا کھڑا ہو جاتا۔ اس کے ارد گرد تقریباً دو سو بچے کھڑے بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے، اکثر کی متلاشی نگاہیں، فضا کی وسعتوں میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھیں، بچوں سے ذرا آگے چند پی ٹی ماسٹر کھڑے تھے، ان کے چہروں پر بھی بے چینی کے آثار واضح ہوتے جارہے تھے ...... ان کی کلائیاں بار بار گھوم کر ان کی نگاہوں کے سامنے آجاتیں۔ اور پھر وہ آپس میں دبی دبی سرگوشیاں کرنے لگتے۔

تمام بچے اپنی ریہرسل کر چکے تھے۔ ائیر پورٹ کے وسیع میدان میں فوج اور نیوی کے جوان چاق وچوبند کھڑے تھے، ان سب کو وزیراعظم کا انتظار تھا۔ وزیر اعظم کے ہمراہ دوست ملک کے

صدر بھی آ رہے تھے۔ جونہی وزیر اعظم کا طیارہ ائیر پورٹ کی سطح کو چھوتا، تمام سپاہی الرٹ ہو جاتے، وزیر اعظم، مہمان اپنے سفیروں، مشیروں اور وزیروں کی فوج کے ساتھ زمین پر قدم اتارتے۔ سب سے پہلے دو بچے آگے بڑھ کر مہمان اور وزیر اعظم کا استقبال کرتے، انہیں پھولوں کا گلدستہ پیش کیا جاتا۔ پھر استقبال کے لئے آنے والے معززین شہر اور ممبر صوبائی اسمبلی اور صوبائی وزیروں کی فوج ظفر موج سے مہمان کا تعارف کرایا جاتا...... مہمان باری باری ان سے ہاتھ ملاتے، خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کرتے، پھر تمام بچے ان کے سامنے پی ٹی کا مظاہرہ کرتے، اس کے بعد یہ قافلہ ائیر پورٹ کے قریب ہی ایک وسیع میدان میں پہنچتا، جہاں خصوصی طور پر ایک جلسے کا انعقاد کیا گیا تھا۔

آج چونکہ پوری دنیا میں محنت کش بچوں کا عالمی دن منایا جا رہا تھا۔ اس لئے مقررین نے پہلے سے ہی خصوصی طور پر تقریریں تیار کر لی تھیں۔ جن بچوں کو تقریریں کرنا تھیں، انہوں نے اپنے بھائیوں یا اساتذہ سے لکھوالی تھیں۔ جن وزیروں کو مائیک پر محنت کش بچوں کے مسائل اور حقوق کے حوالے سے بولنا تھا، انہوں نے بھی ایک دن پہلے اپنے مشیروں سے تقریریں لکھوالی تھیں۔

ساری تیاریاں مکمل تھیں، صرف مہمان خصوصی کا انتظار تھا۔ سب کو علم تھا کہ وزیر اعظم کا جہاز گیارہ بجے پہنچے گا، مگر پھر بھی صبح ہی سے لوگ تیار ہو گئے تھے۔

اسکول سے ائیر پورٹ روانہ ہوتے وقت راشد نے عمران سر سے پوچھا تھا۔ "سر ہم وہاں سے کتنے بجے فارغ ہو جائیں گے؟"

"تقریباً دو بج جائیں گے۔" عمران سر نے رسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

راشد نے حساب لگایا، ائیر پورٹ سے گھر واپس پہنچتے پہنچتے اسے تین بج جائیں گے...... "اوہ اس طرح تو اسے کافی دیر ہو جائے گی۔" دیر تو خیر دو بجے بھی ہو جاتی۔ اسے تو اسکول سے چھٹی ہوتے ہی ٹھیک ساڑھے بارہ بجے گھر پہنچنا ہوتا ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے عمران سر سے کہا۔ "سر ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں آج نہ جاؤں۔"

عمران سر نے اسے گھور کر دیکھا۔ "تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا...... تمہیں معلوم ہے کہ تم پی ٹی میں اپنی کلاس کو لیڈ کرو گے...... اور پروگرام کے مطابق پھولوں کا گلدستہ بھی تمہیں ہی مہمان صاحب کو پیش کرنا ہے......"

راشد خاموش ہو گیا...... اس وقت اس کی پنڈلی میں ٹیس سی اٹھی تھی۔ عمران سر کے کلاس روم سے نکلتے ہی اس نے اپنی پنڈلی کے معمولی سے زخم کو دیکھا جو کل شام اس وقت لگا تھا جب وہ سائیکل پر بازار سے گھر واپس آ رہا تھا۔ لیکن اب یہ معمولی سا زخم مزید تکلیف کا سبب بن رہا تھا...... پنڈلی سوج رہی تھی۔ اور مسلسل درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے سوچا عمران سر کو بتا دے کہ اس کی

ٹانگ میں تکلیف ہے لیکن پھر اس نے اپنا یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ اسے عمران سر کے غصے سے ڈر لگتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ عمران سر اس کی ٹانگ کو دیکھنے کی تکلیف بھی گوارا نہیں کریں گے اور اسے بے نقط سنائیں گے ____ اور کہیں گے کہ وہ نہ جانے کے لئے بہانے بنا رہا ہے۔

پھر ایک بڑی بس میں تمام بچے بھر کر ائیرپورٹ پہنچے تھے۔ وہاں دوسرے اسکولوں سے بھی بچے آئے ہوئے تھے، لیکن ان کے اسکول کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ ہر مرتبہ جب بھی کوئی اہم شخصیت شہر میں آتی تھی تو ائیرپورٹ پر ان کا استقبال کرنے اور انہیں پھولوں کا گلدستہ پیش کرنے کے لئے ان کے اسکول کے کسی بچے کا چناؤ ہوتا تھا۔ اور اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ راشد نے پچھلے سال ہی اس اسکول میں داخلہ لیا تھا یہ پہلا اتفاق تھا کہ اسے اس اہم کام کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔

دھوپ کی شدت میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا، مگر رن وے دور دور تک سنسان تھا، لوگ آپس میں چہ مگوئیاں کرنے لگے تھے۔ بچے بے چینی سے پہلو بدل رہے تھے۔ اور آنکھوں پر ہاتھ سے سایہ کر کے دور آسمان پر مہمان کا طیارہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ راشد کو اس قدر بے چینی تھی کہ اسے دور پرواز کرتی چیل پر بھی طیارے کا گمان ہونے لگا تھا۔ جب وہ سیاہ دھبہ ہوا میں تیرتا ہوا قریب آتا تو اسے مایوسی ہو جاتی۔

عمران سر کے کہنے پر اس نے بھی محنت کش بچوں کے حوالے سے ایک مختصر سی تقریر یاد کر لی تھی، یہ تقریر اس نے رات کو دیر تک بیٹھ کر لکھی تھی اور خوب یاد بھی کر لی تھی۔ اسے عمران سر نے اچھی طرح بتایا تھا کہ کس طرح تقریر شروع کرتے وقت مہمان کے سامنے گردن خم کرنا ہے اور کس طرح اپنے الفاظ میں گونج پیدا کرنا ہے۔ راشد کی آواز بہت پاٹ دار تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ اسکول کے کئی مقابلوں میں تقریریں کر کے انعام حاصل کر چکا تھا، لیکن چھ ماہ قبل جب اس کے والد کا انتقال ہوا تو اس نے اس طرف توجہ کم کر دی تھی۔ اسے اپنی تقریر کے الفاظ اچھی طرح یاد تھے۔

جناب صدر

آج پوری دنیا میں محنت کش بچوں کا عالمی دن منایا جا رہا ہے۔ ان علاقوں میں کم جہاں محنت کش بچے ہیں اور ان علاقوں میں زیادہ جہاں کے بچے محنت کے مفہوم سے بھی نا آشنا ہیں۔ کیسی ستم ظریفی ہے کہ مستقبل کے یہ معمار جنہیں آگے چل کر ملک و قوم کی باگ ڈور سنبھالنا ہے۔ اپنا وہ وقت جب انہیں صرف اور صرف پڑھنا چاہئے، چھوٹے چھوٹے کارخانوں، ہوٹلوں اور ورکشاپوں میں گزار رہے ہیں۔ قوم کو ان بچوں پر فخر ہونا چاہئے کہ آنے والے کل کے یہ معمار بچپن سے ہی محنت اور رزق حلال کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں۔ لیکن میں قوم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ اچھا نہیں ہوتا کہ ان ننھے ننھے معصوم بچوں کے ہاتھوں

سے اوزار لے کر ان میں قلم تھمادیئے جاتے۔ میں مانتا ہوں کہ ہمیں کاریگروں کی ضرورت ہے۔ لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں کاریگروں سے زیادہ دانشوروں کی ضرورت ہے ......

راشد زیر لب اپنی تقریر کے الفاظ بھی دہراتا جا رہا تھا۔ عمران سر کو یقین تھا کہ اس کی شاندار تقریر کے بعد وزیر اعظم ضرور ان کے اسکول کے لئے بھی لمبی چوڑی رقم کی گرانٹ منظور کر دیں گی۔

اچانک راشد کو یوں محسوس ہوا کہ وہ تقریر کے الفاظ بھول گیا ہے۔ ساری تقریر گڈمڈ ہو کر اس کے ذہن میں ناچنے لگی۔ اس نے سر جھٹک کر جملوں کو ترتیب دینا چاہا، مگر ناکام رہا۔ دھوپ کی شدت اور سخت گرمی نے اس کی زبان میں مرچیں سی لگا دی تھیں۔ اس نے پریشانی میں ادھر ادھر دیکھا۔ دور ائیر پورٹ کی عمارت کے پاس ایک کولر رکھا ہوا تھا۔ جہاں میزبان اور معززین شہر، کھڑے ہو کر دل بہلا رہے تھے ...... اس کی زبان میں کانٹے چبھنے لگے۔ ساتھ ساتھ اس کی پنڈلی میں بھی ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ وہ بے چینی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ تقریباً تمام بچے پریشان پریشان کھڑے تھے۔ سخت گرمی اور چلچلاتی دھوپ انہیں بھی پریشان کر رہی تھی۔ مگر مہمان کا استقبال کرنے کی ڈیوٹی انہیں سخت دھوپ میں بھی کھڑا رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔

جوں جوں وزیر اعظم کے طیارے کے پہنچے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ ایک عجیب سا سکوت طاری ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ٹھیک بارہ بجے بیک وقت سب کی نگاہیں فضا میں وزیر اعظم کے طیارے کو تلاش کرنے لگیں۔ مگر دور دور تک آسمان صاف تھا......

عین اسی وقت ائیر پورٹ کی عمارت سے ایک شخص تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا، ان کے قریب آیا۔ اس کے ہاتھ میں موبائل فون تھا۔ اس نے کہا۔ "وزیر اعظم کی اچانک طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ ان کا پروگرام کینسل ہو گیا۔" سب کے ستے ہوئے چہرے ڈھیلے پڑ گئے۔ بچوں کے چہروں پر رونق دوڑ گئی۔ کچھ دیر بعد تمام بچے مختلف قطاروں میں ائیر پورٹ کی عمارت سے باہر نکلنے لگے۔

جب وہ گھر پہنچا تو ایک بج چکا تھا۔ اس کی امی صحن میں ہی بیٹھی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی بولیں۔ "آ گیا میرا بیٹا...... کیسی تکلیف ہے پاؤں کی......"

"ٹھیک ہے امی۔" اس نے کہا اور اپنی سائیکل اٹھا کر دروازے سے باہر نکلنے لگا۔

"ارے ...... کھانا تو کھاتا جا......"

"نہیں امی آج بہت دیر ہو گئی ہے...... واپس آ کر کھاؤں گا۔"

اس کا رخ بازار کی طرف تھا، جہاں شمیم بک ڈپو سے اسے شام کا اخبار اٹھا کر بازار میں فروخت کرنا تھا۔ راشد وزیر اعظم کا دل سے شکر گزار تھا۔ محنت کش بچوں کے جلسے میں شرکت نہ کر کے انہوں نے اسے ایک نقصان سے بچا لیا تھا ورنہ راشد کی آج کی "دیہاڑی" ماری جاتی۔

دُنیا اپنا گھر ہے یارو.....

محمد جاوید خالد

دنیا اپنا گھر ہے یارو دنیا اپنا گھر
اپنا گھر ہے پیارا ہم کو یہ اپنا دلبر
اس کے لئے تو دکھ بھی سارے سہہ لیں گے ہنس کر
اس کی خاطر ہم کھولیں گے سکھ کا ہر اک در
دنیا اپنا گھر ہے یارو دنیا اپنا گھر

نرم بچھونے، کھیل کے سامان ہم کو نہیں معلوم
اپنے ہنر کی لیکن ساری دنیا میں ہے دھوم
اور ہمارے نعرے سے ہاں سب جاتے ہیں جھوم
من میں ہمارے لالچ ہے نہ دل میں کسی کا ڈر
دنیا اپنا گھر ہے یارو دنیا اپنا گھر

سوچیں تو دنیا سے ہم نے آخر کیا ہے پایا
کچھ پایا تو اس سے زیادہ ہی اس کو لوٹایا
لیکن پھر بھی دل میں ہمارے ایک خیال سمایا
اپنے گھر کو ہم پھولوں سے اک دن دیں گے بھر
دنیا اپنا گھر ہے یارو دنیا اپنا گھر

علم ہمارے پاس جو ہوتا کیا اچھی تھی بات!!
اس سے بھی کچھ بڑھ کر ہوتے اپنے حسیں جذبات
اس سے زیادہ بہتر کرتے ہم گھر کے حالات
خیر کا دامن ہاتھ میں ہوتا پاس نہ آتا شر
دنیا اپنا گھر ہے یارو دنیا اپنا گھر

سب سے بڑے مفکر

اب سے کوئی سوا سو برس پہلے کی بات ہے۔ آدھی رات ہو چکی تھی۔ سب لوگ میٹھی نیند کے مزے لے رہے تھے۔ سیالکوٹ کا سارا شہر غافل سو رہا تھا مگر اس آدھی رات کے سناٹے میں ایک چھوٹا لڑکا لیمپ کے سامنے خاموش بیٹھا اسکول کا کام کر رہا تھا۔ اچانک ماں کی آنکھ کھل گئی۔ بڑا تعجب ہوا کہ بیٹا ابھی تک بیٹھا پڑھ رہا ہے۔ محبت سے آواز دی۔ "بیٹا اب سو جاؤ۔ بہت رات ہو گئی۔" مگر بیٹے نے کوئی جواب نہیں دیا ماں نے پھر آواز دی۔ بیٹا پھر بھی چپکا رہا۔ آخر کار ماں سے نہ رہا گیا۔ اٹھیں، بیٹے کو جھنجھوڑ کر کہا۔ "اب سو جاؤ رات بہت ہو گئی۔" بیٹے نے کہا۔ "اماں سو ہی تو رہا ہوں۔" ہوا یہ تھا کہ بیٹا پڑھنے کی دھن میں بیٹھا پڑھتا رہا۔ رات گزرتی رہی۔ نیند نے زور کیا تو بیٹھے بیٹھے سو گیا۔ علم کے شوق میں اس لڑکے کو رات گزرنے کا کوئی خیال ہی نہیں آیا۔

جب یہ لڑکا بڑا ہوگیا تو اس نے علم کی محبت میں وہ مشہور نظم لکھی جو ہر بچے کو زبانی یاد ہے اور ہر بچہ اسے پڑھتا ہے۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
زندگی ہو میری پروانے کی صورت یارب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب

علم سے محبت کرنے والے اس لڑکے کا نام تھا، محمد اقبال۔ آج انہیں ساری دنیا بہت بڑے شاعر، ذہنوں میں اجالا کرنے والے عالم اور پاکستان کا تصور پیش کرنے والے رہ نما کی حیثیت سے جانتی اور پہچانتی ہے۔ بڑا نام ہے، بڑی عزت ہے۔ بچے بوڑھے جوان سب ان کی نظمیں پڑھتے ہیں۔ خوش ہوتے ہیں اور ان سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔

اقبال سیالکوٹ میں پڑھتے رہے۔ بہت ذہین اور ہوشیار تھے۔ محنت کرتے تھے۔ میٹرک میں فرسٹ ڈویژن حاصل کی، وظیفہ ملا کالج میں داخل ہوئے، ایف اے کرلیا۔ سیالکوٹ اس زمانے میں چھوٹا سا شہر تھا۔ کالج بھی چھوٹا تھا۔ انٹر تک پڑھائی ہوتی تھی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے اقبال لاہور آگئے اور ایسے آئے کہ یہیں کے ہوگئے۔ والدین اور دوسرے رشتے دار سیالکوٹ ہی میں رہے۔ اقبال بھی وہاں آتے جاتے رہے مگر ان کی باقی زندگی لاہور میں گزری۔ یہاں وہ گورنمنٹ کالج میں داخل ہوئے۔ بڑا شان دار اور مشہور کالج تھا۔ اقبال نے یہاں سے بی اے کیا۔ ایم اے کیا۔ امتحانوں میں اچھے نمبر حاصل کرنے پر انہیں تمغے ملے۔ کالج میں ان کی بہت شہرت تھی۔ استاد انہیں بہت چاہتے تھے۔ ان کے ایک استاد پروفیسر آرنلڈ ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔

اقبال کالج سے فارغ ہوئے تو وہیں پڑھانے لگے۔ طالب علمی ہی کے زمانے میں وہ لاہور میں بہت اچھے اور نئے خیالات کے شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوچکے تھے۔ سارے شہر میں ان کا شہرہ تھا۔ ان کی غزلیں اور نظمیں بہت پسند کی جاتی تھیں۔ اقبال بڑے اچھے استاد تھے۔ انہوں نے طالب علموں کی سہولت کے لئے اردو، انگریزی میں کتابیں بھی لکھیں۔ ان کتابوں سے طالب علموں کو بڑا فائدہ پہنچا۔

لاہور میں مسلمانوں کی ایک انجمن تھی۔ انجمن حمایت الاسلام۔ مسلمانوں کی اصلاح اور ترقی کے کام کرتی رہتی تھی۔ سال میں ایک دفعہ اس کا سالانہ جلسہ ہوتا تھا۔ دور دور سے لوگ آتے تھے۔ جلسے میں شریک ہوتے تھے۔ اقبال اس جلسے میں اپنی ایک نظم پڑھتے تھے۔ لوگ دیکھتے تھے کہ ایک گورا چٹا دبلا پتلا، خوبصورت جوان، سیاہ اچکن اور ترکی ٹوپی پہنے۔ آنکھوں پر

عینک لگائے ایسے انداز سے سنا رہا ہے کہ سننے والے جھوم رہے ہیں۔ دلوں پر ایک خاص اثر ہو رہا ہے۔ ہر شخص نظم کے اثر میں ڈوبا ہوا ہے۔ بڑا اثر ہوتا تھا ان کی نظم اور پڑھنے کے انداز میں۔ اقبال نے انجمن حمایت الاسلام کے ذریعے سے بعد میں قوم کی بڑی خدمت کی۔

کالج میں پڑھاتے پڑھاتے اقبال کو یہ خیال آیا کہ ولایت جاکر اور تعلیم حاصل کی جائے۔ ترقی کرنے اور آگے بڑھنے والے اسی طرح سوچا کرتے ہیں۔ وہ کالج میں پڑھا رہے تھے۔ عمدہ ملازمت تھی۔ شاعری کی وجہ سے سارے ملک میں دھوم تھی۔ زندگی بڑے آرام سے گزر جاتی مگر اقبال کو یہ دھن تھی کہ اور علم حاصل کیا جائے ذہن کو اور ترقی دی جائے۔ اور علم حاصل کر کے اپنی قوم کو اور زیادہ فائدہ پہنچایا جائے۔ یہ سب سوچ کر اقبال ولایت گئے وہاں کی ایک بڑی مشہور یونیورسٹی کیمبرج میں پڑھا۔ جرمنی میں پڑھا۔ پی ایچ ڈی ہوگئے۔ لندن سے بیرسٹری کا امتحان پاس کرلیا۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد جب وہ وطن واپس ہوئے تو ڈاکٹر محمد اقبال بیرسٹر تھے۔ ان کے کامیاب واپس آنے پر لاہور اور سیالکوٹ میں بڑی خوشیاں منائی گئیں۔

ولایت سے واپس آنے کے بعد کچھ دن تک اقبال نے پڑھانے کا کام کیا مگر ملازمت کا بندھن انہیں پسند نہیں تھا۔ بیرسٹری کرنے لگے اور باقی زندگی اسی آزاد پیشے میں گزاری۔ ان کے مزاج میں قناعت تھی۔ دولت کی ہوس بالکل نہیں تھی۔ اللہ تعالٰی نے بیرسٹری میں برکت دی اور وہ ساری زندگی خوش اور مطمئن رہے۔ مزاج میں سادگی تھی۔ دوستوں اور عزیزوں پر جان چھڑکتے تھے۔ دوست احباب ان کے گھر جمع ہوتے۔ بڑی رونق رہتی۔

ولایت جانے سے پہلے ہی سارے ملک میں اقبال کی شاعری کی دھوم تھی واپس آئے تو ان کا انداز بدلا ہوا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ولایت میں انہیں ساری دنیا کے مسلمانوں کی تاریخ اور حالات کو سمجھنے کا موقع ملا۔ اسلام ایک دریا کی طرح بڑھتا چلا گیا۔ ایشیا میں بھی پھیلا یورپ میں بھی پھیلا یہ ساری دنیا کے لئے نجات، سلامتی اور ترقی کا پیغام لے کر آیا تھا۔ اس پیغام نے ہر جگہ اجالا کر دیا مسلمانوں نے اس پیغام کے ذریعے سے ساری دنیا کو علم سکھایا، تہذیب سکھائی، اچھی زندگی گزارنے کے ڈھنگ سکھائے۔ نیکی سچائی اور دوسرے انسانوں کی خدمت کا شوق پیدا کیا مگر آہستہ آہستہ ساری دنیا پر چھا جانے والے مسلمان اپنی تعلیم اور اپنے اصولوں کو بھلا کر مایوسی اور غلامی کا شکار ہوگئے۔ اقبال نے ان باتوں پر غور کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں نے عمل، غیرت اور قناعت کو بھلا

دیا۔ ایک ملت ہونے کے بجائے چھوٹی چھوٹی قوموں میں بٹ گئے۔ اس وجہ سے بڑا نقصان اٹھایا، کمزور ہوگئے اور اسلام کے راستے سے دور ہوگئے۔ یہ سب کچھ سوچ کر اقبال نے اپنی شاعری میں ملت کو بیداری کا پیغام سنایا۔ یہ پیغام عمل کا پیغام تھا۔ غیرت اور حمیت کا پیغام تھا، قناعت اور سادہ زندگی گزارنے کا پیغام تھا۔ جدوجہد کوشش اور اتحاد کا پیغام تھا۔ ساری دنیا کے مسلمان ایک ہوں، مل جل کر ترقی کریں آگے بڑھیں اور ساری دنیا کے لئے اللہ کی رحمت بن جائیں۔ اقبال نے بڑی دردمندی، بڑی خوب صورتی، بڑی محبت اور خلوص سے یہ پیغام اپنی شاعری کے ذریعے سے پھیلا دیا۔ ان کی شاعری میں بڑا جوش تھا سچا جذبہ تھا علم کی گہرائی تھی۔ روشنی تھی، خلوص اور اثر تھا۔ اردو کے ساتھ ساتھ وہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ اس وجہ سے زیادہ لوگ ان کی شاعری سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ بیسویں صدی کے مسلمانوں کی بیداری میں اقبال کی شاعری کا بڑا حصہ ہے۔ ان کی کتابیں بانگِ درا، بالِ جبریل اور ضربِ کلیم ان کے پیغام اور شاعری کا بڑا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ اس طرح ان کی فارسی کتابیں اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، پیامِ مشرق، زبورِ عجم، جاوید نامہ مسافر اور پس چہ باید کرد برصغیر اور ایران میں بڑے شوق سے پڑھی جاتی ہیں اور انہیں دنیا کی نہایت عمدہ شاعری میں شمار کیا جاتا ہے۔

اقبال بڑے شاعر تھے مگر انہوں نے بچوں کے لئے بعض بڑی عمدہ نظمیں لکھی ہیں۔ بچے کی دعا، ہمدردی اور بعض دوسری نظمیں بچوں میں بڑی مقبول ہیں۔ اقبال کی ساری زندگی ملت کی ترقی کے لئے وقف تھی۔ شعر کہے، ملت کے لئے پھر ملت کی ترقی کے لئے ملکی سیاست میں بھی حصہ لیا۔ پنجاب اسمبلی کے ممبر رہے، عام آدمی کے فائدے کے قانون بنوائے۔ مسلم لیگ اس زمانے میں مسلمانوں کی مشہور سیاسی جماعت تھی۔ اس میں شامل ہوئے۔ ۳۰ء میں مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ بھارت کے ایک شہر الہ آباد میں ہوا۔ اقبال نے مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے اس جلسے کی صدارت کی۔ انہوں نے اس جلسے میں جو خطبہ پڑھا تھا وہی پاکستان کے تصور کی بنیاد ہے۔ اس بنیاد پر کام ہوتا رہا اور پھر دس برس بعد ۱۹۴۰ء میں لاہور میں پاکستان قائم کرنے کی قرارداد منظور ہوگئی۔ سیاسی رہنما کی حیثیت سے اقبال کی بڑی عزت تھی۔ قائداعظم محمد علی جناح ان پر بڑا بھروسا کرتے تھے اور ان کی رائے کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔

انگریز حکومت کو بھی اقبال کی بڑائی اور ان کی شاعری کی اہمیت کا احساس تھا۔ اس اہمیت کی

وجہ سے انگریز حکومت نے انہیں سر کا خطاب دیا تھا مگر ان کا سچا خطاب "شاعر مشرق" ہے۔ ساری دنیا میں وہ شاعر مشرق سمجھے اور کہے جاتے ہیں۔

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو شاعر مشرق اللہ تعالیٰ سے جا ملے۔ لاہور میں شاہی مسجد کے دامن میں ان کا مزار ہے جہاں ان سے محبت رکھنے والے دور دور سے آتے ہیں اور فاتحہ پڑھتے ہیں۔ پاکستان اور دنیا کے بہت سے ملکوں میں شاعر مشرق کے نام پر ادارے اور انجمنیں قائم ہیں جو ان کے بارے میں کام کرتی رہتی ہیں۔ ۱۹۷۷ء میں شاعر مشرق کی پیدائش کا سو سالہ جشن بھی منایا گیا تھا۔ بڑے بڑے جلسے اور کانفرنسیں ہوئی تھیں۔ شاعر مشرق کے بارے میں اچھی اچھی کتابیں بھی چھپی تھیں۔ بڑا کام ہوا اور اب بھی ہو رہا ہے۔

شاعر مشرق بظاہر اب ہم میں نہیں مگر ان کی شاعری اور کارنامے زندہ ہیں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ان کی جگہ ہمارے دل میں ہے اور ہمارے بعد میں آنے والوں کے دلوں میں بھی ہو گی۔

رحم دلی

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ایک ایسی عورت پر ہوا جو چولہے میں آگ جلا رہی تھی اور اس کا ننھا سا بچہ اس کی گود میں تھا۔ اس عورت نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا۔ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں میں پوچھتی ہوں کیا اللہ اپنے بندوں پر اس سے زیادہ مہربان نہیں جس قدر کہ ماں اپنے بچے پر مہربان ہوتی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "بے شک اللہ اپنے بندوں پر اس سے زیادہ مہربان ہے۔" عورت نے کہا کہ "ماں تو اپنے بچے کو کبھی آگ میں نہیں ڈالتی۔" یہ سن کر رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم بے اختیار رونے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اللہ اس بندے کو دوزخ کی آگ میں ڈالے گا جو اس سے سرکشی کرتا ہے اور اسے جو اس کو ایک نہیں مانتا۔" رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کو پرندوں کے انڈے یا ان کے بچے اٹھا لانے اور جانوروں پر ظلم کرنے سے بھی منع فرماتے تھے۔ ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک انصاری کے باغ میں اونٹ دیکھا جو بھوک سے بلبلانے لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور اس کے مالک کو بلا کر کہا کہ "تم اس جانور کے معاملے میں خدا سے نہیں ڈرتے؟"

آنکھ مچولی البم

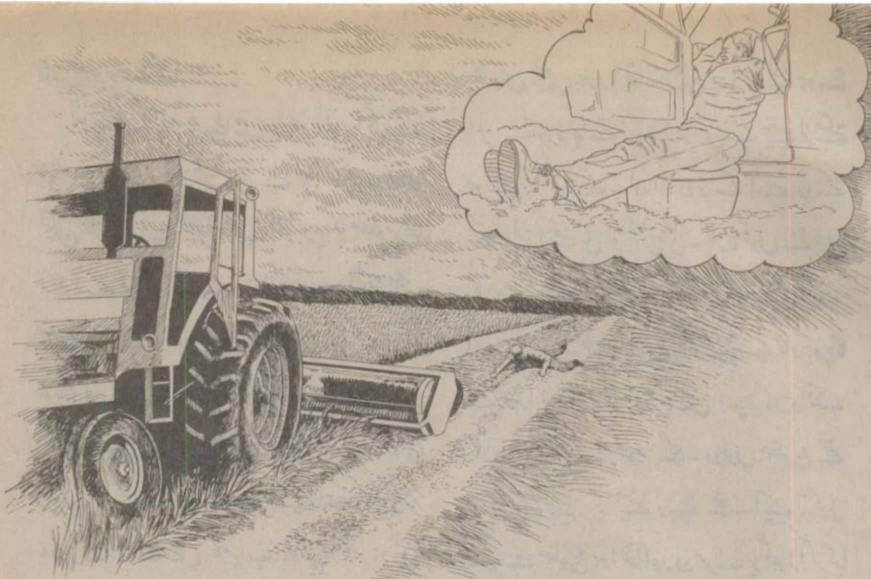

باہمت انسان

ریحانہ مُنیر

کہیں سے مدد ملنے کی امید نہیں تھی۔ اسے احساس تھا کہ اس کی زندگی خود اس کے ہاتھ میں ہے ----

یہ نومبر ۱۹۸۶ء کی صبح کا ذکر ہے۔

گونزیلز (لوئیزیانا) کے جنوب میں اکیاون سالہ ٹریووی آرگریو اپنے طویل و عریض کھیتوں میں سویرے سے کام کررہا تھا۔ آخری چالیس ایکڑ پر کام جاری تھا اور لمبی خشک گھاس سعادت مندی سے طاقت ور کٹر کے سامنے بچھی جارہی تھی جو ٹریکٹر کے پیچھے بندھا مست ہاتھی کی طرح جھومتا چلا آرہا تھا۔ ساڑھے نو بج چکے تھے اور آدھے رقبے کی گھاس صاف کی جاچکی تھی۔ آرگریو کا خیال تھا کہ وہ دوپہر تک اپنے کام سے

فارغ ہوجائے گا۔

اچانک ٹریکٹر نالے میں جا پھنسا اور انجن بند ہوگیا۔ اگنیشن گزشتہ دن سے ہی خراب تھا۔ لیکن فکر کی بات نہیں تھی۔ آرگریو کو معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وہ اسٹارٹر کے دو الیکٹریکل کنکشنز کے درمیان چاقو کے ایک بلیڈ کو رکھ کر ٹریکٹر کو دوبارہ اسٹارٹ کرسکتا تھا۔ اس نے گھاس کٹر کو بجلی کی سپلائی بند کی اور ٹریکٹر کے سامنے کی طرف کود گیا۔ اپنے آزمودہ طریقے سے وہ ٹریکٹر اسٹارٹ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ مگر جونہی کرنٹ بحال ہوا ٹریکٹر نے جمپ لیا اور آگے کی طرف دوڑا۔ بجلی کی سی تیزی سے، سانپ کی طرح بل کھاتے ہوئے اس نے خود کو ٹریکٹر کے پچھلے ٹائروں کے نیچے آنے سے بچایا اور سوچا کہ شاید وہ گاڑی کو گیئر سے نکالنا بھول گیا تھا۔ یقیناً" ......اس سے ایک بھول اور بھی ہو چکی تھی اور وہ یہ کہ ٹریکٹر کے پیچھے منوں وزنی کٹر بھی بندھا ہوا ہے۔ جس وقت اسے اس بات کا احساس ہوا، بہت دیر ہو چکی تھی۔ کوئی راہ فرار نہیں تھی۔ چوڑا کٹر سیدھا اس پر چڑھا آرہا تھا۔ اس نے بچنے کی اپنی سی کوشش کی مگر کٹر کا دایاں پہیہ اس کو کولہوں پر سے کچلتا ہوا نکل گیا۔

وہ مکمل طور پر ہوش میں تھا۔ کوئی درد بھی محسوس نہیں ہورہا تھا۔ زمین پر الٹا لیٹے ہوئے اس نے دور جاتے ٹریکٹر اور اس کے پیچھے لڑھکتے ہوئے کٹر کو دیکھا۔ فوراً" دوڑ کے اسے روکنے کے لئے اٹھنے کی کوشش کی۔ مگر ٹانگوں نے اس کا بوجھ اٹھانے سے انکار کردیا۔ تب اسے احساس ہوا کہ اس کا نیچے کا دھڑ تو بے کار ہو چکا ہے۔فوراً" اس کے ذہن میں اپنے دو واقف کاروں کے چہرے گھوم گئے۔ دونوں مفلوج تھے اور وہیل چیئر پر بیٹھے رہتے تھے۔ ایک تو گولی لگنے سے مفلوج ہوا تھا اور دوسرے پر گھوڑا گر گیا تھا۔ "اوہ میرے خدا۔۔۔۔۔کیا اب مجھے بھی وہیل چیئر پر بیٹھنا پڑے گا۔" اس نے خوف سے سوچا۔

آرگریو نے جوتوں کے اندر اپنے پنجوں کو حرکت دینے کی کوشش کی۔ وہ ہل سکتے تھے۔ تھوڑی سی کوشش سے وہ اپنے گھٹنوں کو بھی حرکت دینے میں کامیاب ہوگیا۔ مگر جونہی اس نے پوری ٹانگ کو ہلانے کی کوشش کی، اسے احساس ہوا کہ یہ اس کے بس میں نہیں رہا۔ باقی جسم سے ٹانگوں کا رابطہ کٹ چکا تھا۔ اس نے سوچا یقیناً" ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ چکی ہے اور شاید پیڑو کی بھی۔" اس نے مایوسی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھا۔ مگر دور دور تک سناٹا تھا۔ وہاں اس کی مدد

کے لئے کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ یہ کھیت ایک صنعتی گیس پلانٹ کے عقب میں واقع تھا۔ایک طرف آئل ریفائنری کو جانے والی کچی سڑک تھی مگر وہاں بھی زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ کیونکہ آج اتوار تھا اور لوگ چھٹی کے مزے لوٹ رہے تھے۔

گھر سے بھی کسی کے آنے کی امید نہیں تھی۔ پندرہ میل دور اس کے بیوی بچوں کو اس کی غیر موجودگی کا احساس رات گئے سے پہلے نہیں ہو سکتا تھا۔ آرگریو بڑا زمیندار تھا۔ضلع بھر میں پھیلی ہوئی اس کی بڑی جائیداد تھی۔ ایک بار صبح گھر سے نکلنے کے بعد اسے تلاش کرنا آسان کام نہیں تھا۔ پھر کھیتوں پر شام تک کام کرنا اس کا معمول تھا۔گھر والوں کو پریشانی تو اس وقت ہوتی جب وہ بہت دیر تک گھر نہ پہنچتا۔ مگر اتنی دیر مدد کے انتظار میں بے یارو مددگار پڑا رہنا اس کے مزاج کے خلاف تھا۔ اس کی زندگی خود اس کے اپنے ہاتھ میں تھی۔ اس نے زندگی کے لئے جدوجہد کرنے کا فیصلہ کیا اور گردن اٹھا کر سامنے کی طرف دیکھا۔

"شاید گیس پلانٹ کا چوکیدار ڈیوٹی پر ہو!" اس نے سوچا مگر پلانٹ کی باڑھ تک پہنچنے کے لئے اسے ہزار فٹ تک بغیر کٹی گھاس میں گھسٹنا پڑتا۔گھاس میں گھسنے کے بعد باہر سے اس کا دیکھا جانا ممکن نہ رہتا اور یہ خطرناک بات ہوتی، اس نے سوچا کہ اپنی فورڈ برونکو تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ جو دوسری طرف کھیت کے آخری کنارے پر کھڑی تھی۔ ایک بار وہ وہاں تک پہنچ جاتا تو گونزیلز تک پہنچنے کی کوئی نہ کوئی صورت ضرور نکل آتی۔ اس نے اندازہ لگایا کہ اسے کم از کم ایک میل تک اپنے بدن کو گھسیٹنا ہوگا۔ ڈرتے ڈرتے اس نے ہاتھوں اور گھٹنوں کی مدد سے آگے بڑھنا چاہا۔ مگر فوراً" ہی بے دم سا ہو کر گر پڑا۔ ایک منٹ آرام کیا۔ گہرے سانس لئے۔ پھر کہنیوں کی مدد سے گھسٹنا چاہا۔ مگر وزن زیادہ تھا۔پیروں کی طرف سے کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی۔ دوبارہ لیٹ گیا۔ ایک ہی راستہ رہ جاتا تھا کہ وہ اپنے ایک ہاتھ کی مٹھی سے زمین پر دباؤ ڈالتا اور دوسرے ہاتھ اور کلائی کی مدد سے آگے کو گھسٹتا۔ سو اس نے اس طریقے کو اپنایا اور اللہ کا نام لے کر اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔ اس نے دس دس بارہ بارہ فٹ کے قطعات کو اپنی منزل بنایا اور ایک دفعہ میں اسے عبور کرنے کی کوشش کی۔ بارہا وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ہدف تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کی قوت جواب دے جاتی۔ وہ بے جان سا ہو کر زمین پر

ڈھیر ہو جاتا اور بری طرح ہانپنے لگتا۔ کچھ دیر آرام کے بعد اس کی سانس اور قوت بحال ہوتی تو دوبارہ سفر شروع ہو جاتا۔ یہ بار بار لٹکنے والی ورزش کی طرح معاملہ تھا اور اسے ہزاروں بار اس عمل کو دہرانا تھا۔ سفر کے دوران جب ایک فٹ گہرا اور ڈھائی فٹ چوڑا "کھالا" آیا تو اسے عبور کرنا آرگریو کو دنیا کا مشکل ترین کام لگا۔ جونہی وہ گڑھے میں جھکا' اس کی کمر کے اکڑے ہوئے جوڑوں میں شدید درد ہوا۔ اس نے تڑپ کر اپنی پوزیشن تبدیل کی اور ٹیڑھا ہو کر یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوا۔ اس کامیابی تک پہنچنے کے لئے اسے کئی منٹ تک انتھک محنت کرنا پڑی۔

"ابھی پانچ کھالے باقی ہیں۔" دوسرے کنارے پر پہنچ کر آرگریو نے سوچا۔

وہ ایک سخت جان انسان تھا۔ اس کی ساری زندگی باہر گزری تھی۔ اس حادثے کے ابتدائی جھٹکے کو وہ بڑی خوبی سے سہہ گیا تھا۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی توانائیاں کم سے کم ہوتی جا رہی تھیں۔ اور وہ پریشان تھا کہ کہیں اس کا دھڑ بالکل ہی ساکت نہ ہو جائے وہ رہ رہ کر اپنے پنجوں اور گھٹنوں کو حرکت دیتا تھا۔ خود کو ہمت دلاتا تھا اور بار بار سامنے کی طرف دیکھتا تھا کہ منزل ابھی کتنی دور ہے۔ یا شاید کہ کوئی بھولا بھٹکا شخص ادھر آنکلے اور یوں غیب سے اس کی مدد کا سامان ہو۔

ایک بجے دوپہر تک مسلسل جدوجہد کے بعد وہ خاصا تھک گیا تھا۔ ایک جگہ اس نے انتہائی تھکن کے مارے اپنے بے جان ہوتے ہوئے سر کو زمین پر رکھ دیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ اچانک اسے چہرے پر شدید چبھن کا احساس ہوا۔ یوں جیسے بیسیوں سوئیاں اس کے گالوں' ٹھوڑی اور پپوٹوں میں اتار دی گئی ہوں۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں۔ سرخ زہریلی چیونٹیاں اس کے سارے بدن پر پھیلی ہوئی تھیں۔ گھاس کاٹنے کے دوران کٹر سے ان کے گھر تباہ ہو گئے تھے اور وہ ان کی تعمیرِ نو میں مصروف تھیں کہ غریب آرگریو یہاں آن پھنسا۔ غصے میں بھنائی ہوئی ننھی مخلوق نے اس کی خوب خبر لی تھی۔ دوسری طرف آرگریو کے لئے یہ ایک نئی مصیبت تھی۔ جس سے فوراً چھٹکارا ممکن نہیں تھا۔ چیونٹیاں اس کے ہاتھوں پر' کلائیوں' سینے' منہ' سر' آنکھوں حتیٰ کہ جینز تک میں گھس آئی تھیں اور مسلسل کاٹ رہی تھیں۔ تھکن کی وجہ سے آرگریو حرکت کرنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ اس نے بہتر یہی سمجھا کہ چیونٹیوں کی طرف سے دھیان

ہٹا کر اپنی منزل کی طرف لگائے۔ اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوگیا۔ اس نے دانتوں سے رگڑ کر اپنی زبان پر سے چیونٹیوں کو ہٹایا اور ایک طرف تھوک دیا۔ "یہاں مزے کرو۔" وہ بولا...اور دوبارہ گھسٹنے میں مصروف ہوگیا۔ چیونٹیاں جسم پر سرخ نشان چھوڑتے ہوئے آہستہ آہستہ گرتی گئیں اور وہ آگے بڑھتا رہا۔ تین بجے سہہ پہر تک وہ بمشکل آدھا فاصلہ طے کرسکا۔

"اوہ گاڑی تو اب بھی میری پہنچ سے دور ہے؟" پہلی بار اس کے دل میں خوف نے سر ابھارا۔ لیکن اس نے کمال جرآت سے اس خوف پر قابو پالیا۔ اس نے کہا "اللہ نے مجھے طاقت دی ہے.....اب یہ میرا فرض ہے کہ میں اسے کام میں لاؤں۔" آرگریو بہت فرض شناس تھا۔ ناکامی کا لفظ اس کی لغت میں نہیں تھا۔ اس نے بلند آواز میں خود اپنی ہمت بڑھانا شروع کردی۔

"جوان یہ کام مشکل ضرور ہے......لیکن تمہارے لئے ناممکن نہیں..... تمہیں ضرور اپنی منزل تک پہنچنا ہے۔" اس طرح اسے نیا حوصلہ ملا اور اس کا سفر دوبارہ شروع ہوا۔

اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اندھیرا پھیلنے کے بعد بھی اسے خاصی دیر چلنا ہوگا۔ یہ واقعی پریشانی کی بات تھی۔ کیونکہ خزاں کی سرد رات میں کھلے آسمان کے نیچے شبنم کی زد میں ایک زخمی آدمی کا زندہ بچ رہنا ممکن نہیں تھا۔ ایک اور خطرناک بات یہ ہوئی تھی کہ وہ گاڑی کا دروازہ کھلا چھوڑ آیا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ اندر کی لائٹ جل رہی تھی اور بیٹری آہستہ آہستہ استعمال ہورہی تھی "اگر اس کے وہاں پہنچتے پہنچتے بیٹری بالکل ڈاؤن ہوگئی تو ....."وہ گھسٹتے گھسٹتے ذہن میں آئندہ کا پروگرام بھی بنارہا تھا۔ اور اس سے بہتر پروگرام کیا ہوسکتا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو وہ گاڑی میں موجود برساتی اوڑھ کر گاڑی کے نیچے لیٹ جائے گا تاکہ اوس سے محفوظ رہے۔

اچانک اس نے دو آدمیوں کی آوازیں سنیں جو کسی بات پر آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ امید کی ایک کرن اس کے دل میں پیدا ہوئی اس نے چلا کر انہیں اپنی مدد کے لئے پکارا۔ شور بند ہوگیا مگر کوئی اس کی مدد کو نہیں آیا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ وہ دو آدمی تھے جو چوری چھپے اس کی جاگیر میں شکار کھیلنے آئے تھے اور جنہیں صبح آتے ہوئے اس نے بھگادیا تھا۔

جھٹ پٹے کے ساتھ ہی آئل ریفائنری کی چمنی سے نکلنے والے شعلے نے میدان کو روشن کردیا۔ آرگریو اب محض اپنی قوت ارادی کے

بل پر سفر کر رہا تھا۔ بالآخر رات ساڑھے آٹھ بجے اس کا ہاتھ فورڈ کے اگلے پہیئے سے ٹکرایا۔ اس نے ہزار مشکل سے خود کو ذرا سا بلند کر کے اگنیشن کی چابی گھمائی تو انجن غرا کر بیدار ہو گیا۔ بیٹری میں ابھی جان باقی تھی۔ وہ خوش ہوا۔ مگر ایک مشکل ابھی باقی تھی۔ اوہ یہ کہ اسے گاڑی میں سوار ہونے کے لئے ایک پلیٹ فارم کی ضرورت تھی۔ تاکہ وہ اپنے مردہ دھڑ کو پہلے اس پر رکھے اور بعد ازاں گاڑی کے اندر گھسیٹ لے۔ وہ لڑھکتا ہوا گاڑی کے پچھلے حصے کی طرف آیا۔ اس میں بمشکل سوار ہوا۔ آئس بکس سے سوڈا کے تین ٹن نکالے اور ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔ کچھ جان میں جان آئی۔ پھر اس نے آئس بکس کو گاڑی سے نیچے دھکیلا اور خود کو اس کے برابر میں گرا دیا۔ اب بکس کو اپنے سامنے گھسیٹتے ہوئے وہ اگلے حصے کی طرف آیا اور بہت محنت سے اس پلیٹ فارم کے ذریعے ڈرائیونگ سیٹ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا دایاں پاؤں چند انچ تک اٹھ سکتا تھا اور ایکسلیٹر دبانے کے لئے یہ کافی تھا۔ اس نے ہاتھوں کی مدد سے بائیں پاؤں کو بریک پر رکھا۔ اپنا توازن درست کیا اور اگنیشن میں چابی گھما دی۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور زمین پر پھسلنے لگی۔

"میں گاڑی چلا رہا ہوں!" اس نے حیرت اور خوشی کے عالم میں نعرہ لگایا۔ اس کی آواز گلوگیر تھی۔ گاڑی اس کے قابو میں تھی۔ ایک گھنٹے بعد وہ ریور ویو میڈیکل سینٹر گونزیلز کے ایمرجنسی روم کے سامنے ہارن بجا رہا تھا۔ فوراً ایک نرس بھاگتی ہوئی آئی۔

"شاید میں کمر تڑوا بیٹھا ہوں۔" آرگریو نے کہا۔

"میں اسٹریچر لاتی ہوں۔" نرس نے گھبراہٹ سے کہا .... "تم بالکل حرکت مت کرنا ...." ہسپتال میں آرگریو کا ایکسرے دیکھتے ہوئے سرجن سموئیل آرون حیرت کے سمندر میں غرق تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایک شخص دو دو جگہ سے ٹوٹی ریڑھ کی اور پیڑو کی ہڈیوں، ٹوٹی ہوئی دو پسلیوں، اُدھڑے ہوئے گھٹنے اور جسم پر پھیلے زہریلی چیونٹیوں کے سرخ نشانات کے ساتھ کس طرح گیارہ گھنٹے تک موت سے لڑتا رہا۔ کیسے وہ گاڑی میں سوار ہوا اور کیسے ہسپتال تک پہنچا۔ ڈھائی ہفتے تک آرگریو اس کے زیر علاج رہا اور سرجن حیران ہوتا رہا۔ آرگریو کے گھر چلے جانے کے بعد بھی اس کی حیرت قائم ہے۔ البتہ وہ اس بات کا قائل ہو گیا ہے کہ

ع ہمت کرے انساں تو کیا ہو نہیں سکتا۔

دوستی اچھی نہیں ہے آگ کی

عروبہ مُنیر

آگ سے کھیلنا اُس کا معمول تھا کیونکہ وہ اسٹنٹ مین تھا...

اینڈ ریو ولنس کا خیال تھا کہ وہ ٹی شرٹ پہنے پہنے آگ پر گیسولین چھڑک دے گا اور پھر بھڑکتے شعلوں کے درمیان اپنے کرتب دکھائے گا۔ مگر نہ جانے کیا سوچ کر اس نے فائر پروف جیکٹ پہنی اور اپنے کام میں لگ گیا۔ اتفاق سے گیسولین کے چند قطرے اینڈریو پر جا پڑے اور اس کے کپڑوں میں آگ بھڑک اٹھی۔ خوف سے اس کی جان نکل گئی۔ وہ فوراً زمین پر لوٹنے لگا شعلوں سے دور بھاگنے کی کوشش کی۔ خوش قسمتی سے اس کے دوست نے فوراً آگ بجھانے والے آلے سے آگ بجھادی۔ فائر

سویرے کے عوض

محمد عاقل احمد خان

صبح کاذب کے آثار سے چند لمحے پیشتر برف باری بند ہو گئی...... اس وقت تک پورا میدان برف سے ڈھک چکا تھا۔ جب لوگ اپنے گھروں سے کام پر جانے کے لئے نکلنا شروع ہوئے تو اس وقت کہیں کہیں سے برف ہٹائی جانے لگی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد بادلوں کی اوٹ سے سورج کی کرنوں نے جھانکنا شروع کر دیا۔ برف سے راستہ اتنا ڈھک چکا تھا کہ فٹ پاتھ اور سڑک میں تمیز کرنا مشکل کام تھا۔

وہ بوڑھا جو سفید رنگ کے مکان میں مقیم تھا، اس وقت باورچی خانے کے اندر کام میں مصروف تھا۔ آج شدید سردی کی وجہ سے اس نے چھٹی کر لی تھی۔ اس کا بیٹا کسی دوسرے شہر میں آفیسر تھا۔ بیوی ایک ٹریفک حادثے میں چل بسی تھی۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے آتش دان کی جانب دیکھا۔ آگ اچھی طرح جل رہی تھی۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ گرم کرنے کے انداز میں رگڑنے لگا۔ اس نے کھڑکی کے قریب کی آرام کرسی سنبھال لی۔

اس نے کھڑکی سے اپنا سر ٹکا دیا اور باہر کا نظارہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ باہر سورج کی روشنی میں برف چمک رہی تھی ــــــ اسکول جانے والے بچے برف کی سطح پر جوتوں کے نشانات چھوڑتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو رہے تھے ــــــ کوڑا کرکٹ اٹھانے والی گھوڑا گاڑی قریب ہی کھڑی تھی اور گھوڑے خاموشی سے شدید سردی میں سکڑے کھڑے تھے۔ ان کے نتھنوں کے بالوں پر برف چمک رہی تھی۔ ننھے خاکروب بچے سڑک پر جمی ہوئی برف ہٹانے میں مصروف تھے۔ ان کے گال اور ناک سردی کی شدت سے نیلے ہو رہے تھے۔

وہ سڑک پر جمی ہوئی برف اٹھا اٹھا کر گاڑی کی جانب لے جا رہے تھے۔ جہاں پہلے سے دو بچے بیلچہ لئے ان کے منتظر تھے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اسکول جاتے بچوں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے

اچانک اسے محسوس ہوا جیسے ایک بچہ باغ کے دروازے کے باہر کھڑا اسے ہاتھ ہلا کر اپنی جانب متوجہ کر رہا ہے۔ بوڑھے نے اپنا سر کرسی کی پشت سے کچھ اور اونچا کیا تاکہ وہ اس بچے کو اچھی طرح دیکھ سکے اور سمجھ سکے کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ لیکن یہ بات وہ بچہ بھی بہ خوبی سمجھ سکتا تھا کہ اتنی دور سے وہ اپنی بات کا مفہوم نہیں سمجھا سکتا۔ اسی لئے وہ باغ سے گزر کر کھڑکی کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا ـــــ

وہ ایک دس گیارہ سالہ لڑکا تھا جس کا چہرہ گرد سے اٹا ہوا تھا۔ اس کے نحیف جسم پر نصف آستینوں والی قمیض تھی اور شلوار پر جا بجا پیوند لگے ہوئے تھے۔ کٹے پھٹے کپڑوں سے اس کی سفید جلد چمک رہی تھی۔ گرد سے اس کے بال اٹے ہوئے تھے ـــــ دائیں پیر میں پھٹا ہوا جوتا اور بائیں میں صرف جوتے کا سول ایک ڈوری سے بندھا ہوا تھا۔ سردی کی شدت سے وہ کانپ رہا تھا اور سینے کو اس پتلی سی قمیض سے ڈھانپنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ بوڑھے نے کھڑکی کھول کر باہر جھانکا اور اس سے آنے کا مقصد پوچھا۔ وہ بچہ، بوڑھے کو رحم طلب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"اگر آپ کے یہاں کوئلے توڑنے کے لئے ہیں تو میں یہ خدمت انجام دے سکتا ہوں اور اگر دروازے کے سامنے جمی ہوئی برف کو صاف کروانا چاہیں تو وہ بھی کر سکتا ہوں، مجھے کھانے کے لئے کچھ دیجئے، میں بہت بھوکا ہوں۔" پھر نگاہیں بچھاتے ہوئے اس نے دھیمی آواز میں کہا ـــــ

"مجھے سردی بھی بہت لگ رہی ہے۔"

کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد وہ اس لڑکے کو انکار کرنے والا تھا ـــــ کیوں کہ اس کے پاس کوئلوں کا پورے دو ہفتے کے لئے اسٹاک موجود تھا، لیکن لڑکے کی رحم طلب نظریں اور ملتجیانہ آواز دونوں نے بوڑھے کو بہت متاثر کیا۔ خاص طور پر جب لڑکے نے سردی کی شکایت کی تو بوڑھے نے اپنی جیکٹ کو اور مضبوطی سے اپنے اطراف لپیٹ لیا۔

"ٹھیک ہے بچے، تم پچھلے دروازے سے شیڈ کی جانب جاؤ میں ابھی چابیاں لے کر آتا ہوں۔" لڑکے کے پپڑی جمے ہوئے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ رقص کرنے لگی ـــــ وہ بے اختیار کوئلے کے شیڈ کی جانب بڑھا۔ وہاں پہنچا تو بوڑھا اس کے انتظار میں چابیاں لئے کھڑا تھا۔ بوڑھے نے اسے کوئلوں کا سائز بتایا، پھر مڑا اور باورچی خانے کی جانب چل دیا تاکہ لڑکے کے لئے کھانا گرم کر سکے ـــــ وہ رات کا رکھا ہوا سوپ نکال کر گرم کرنے لگا جسے اب تک کسی نے چکھا تک نہ تھا۔ سوپ گرم کرتے وقت یہ خیال اس کے لئے بہت خوش کن تھا کہ وہ کسی کے لئے اچھا

کام کر رہا ہے۔ اس کا ایمان تھا کہ اگر اسے جنت میں جانا ہے تو دنیا میں اچھے کام کرنے ہوں گے۔ خدا جانتا ہے کہ وہ لڑکا بھوکا ہے لیکن پھر بھی وہ محنت کے جذبے سے سرشار ہے، خدا ایسی باتوں سے بہت خوش ہوتا ہے۔ وہ بے چارہ کس بری طرح سردی سے ٹھٹھر رہا تھا، یہ گرم بھاپ اڑاتا ہوا سوپ کا پیالہ اس کے لئے کافی ہوگا اور سردی کی شدت میں کچھ کمی بھی کر دے گا۔ یہ خیال ہی کتنا اچھا ہے۔

اس جذبے سے سرشار اس کے دل میں ایک شدید خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس لمحے خود کو دیکھے نیک کام کرتے وقت وہ کیسا لگ رہا ہے؟ لیکن چاہنے کے باوجود اس نے اس خیال کو جھٹک دیا ——

باورچی خانے میں واپس آنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ لڑکے کو چائے نہیں دے گا کیوں کہ سوپ ہی اس کے لئے کافی ہوگا —— اس کی نظر میں وہ لڑکا خوش قسمت تھا کہ اس کے پاس آگیا۔ شاید خدا اس لڑکے کو بھیج کر اس طرح میرا امتحان لینا چاہتا ہے، شاید خدا یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اب بھی اچھائیوں کو پسند کرتا ہوں یا نہیں ——

وہ سوپ لے کر جیسے ہی لڑکے کے پاس پہنچا، لڑکے نے اپنے دونوں ہاتھ پتلون سے صاف کر لئے۔ "کام ختم ہو گیا؟" بوڑھے نے پوچھا۔ "کچھ رہتا ہے۔" لڑکا جلدی سے بولا۔

"ٹھیک ہے، پہلے سوپ پی لو، باقی کام بعد میں کر لینا، اس سے قبل کہ یہ گرم سوپ ٹھنڈا ہو، اسے پی لو یہ تمہیں کافی گرمی پہنچائے گا۔"

"اللہ آپ کو اس کا صلہ دے۔"

اس جملے نے بوڑھے کو کافی متاثر کیا کیوں کہ یہ ایک ایسا جملہ نہیں تھا جو عام طور پر پیشہ ور فقیر ادا کرتے ہیں، بلکہ اس لڑکے کے دل کی آواز تھی جو سوپ دیکھنے کے بعد اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلی تھی۔

لڑکے نے ٹرے سنبھالی اور شیڈ کی جانب چل دیا۔ اس نے ٹرے کو اس طرح تھاما ہوا تھا کہ اس میں سے کوئی بھی چیز نہ گرے، درحقیقت بوڑھے کو اس بات کی توقع تھی کہ وہ لڑکا دوبارہ اس کا شکریہ ادا کرے گا۔ لیکن ایسا ہوا نہیں، پھر یہ سوچ کر کہ وہ ایک بار اس کا شکریہ ادا کر چکا ہے، وہ مطمئن ہو گیا جب لڑکا ٹرے واپس لا رہا تو تمام برتن خالی تھے۔

لڑکے کی پھٹی ہوئی قمیض اس کا سینہ ڈھانپنے میں ناکام تھی، چند لمحے بوڑھا اسے دیکھتا رہا، پھر بولا "کیا تمہیں سردی نہیں لگ رہی؟ اپنی قمیض کے بٹن کیوں نہیں لگا لیتے؟"

"ہاں، مجھے سردی تو لگ رہی ہے، لیکن اس کے بٹن نہیں لگا سکتا کیوں کہ وہ ٹوٹے ہوئے ہیں" لڑکے نے بے چارگی سے جواب دیا۔

سب سے پہلے اس نے سوچا کہ لڑکے کو قمیض میں لگانے کے لئے بٹن دے دے لیکن پھر اسے یاد آیا کہ اس کے صندوق میں ایک سوئیٹر

ہے جو اتنا تنگ ہو چکا ہے کہ اب اس کا بیٹا اسے نہیں پہن سکتا، وہ فوراً اس صندوق کی جانب بڑھا۔ اب اسے بڑی بے صبری سے لڑکے کا کام ختم کرنے کا انتظار تھا کہ لڑکا کب کام ختم کرے اور وہ سوئیٹر اس کے حوالے کر دے۔ آخر کار لڑکا کام ختم کرنے کے بعد ہاتھ میں شیڈ کی چابیاں سنبھالے ہوئے واپس آگیا۔ "اس کے علاوہ اور کوئی خدمت جو میں آپ کے لئے انجام دے سکوں؟" بوڑھے نے نظر اٹھا کر تھوڑی دیر تک لڑکے کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ "نہیں اس کے سوا اور کوئی کام نہیں، یہ رہی تمہاری رقم! اور یہ دیکھو! میں تمہارے لئے کیا لایا ہوں! یہ خوبصورت سوئیٹر میرے بیٹے کا ہے، یہ تمہارے بالکل ٹھیک آئے گا۔"

لڑکے نے چند لمحے سوئیٹر کو دیکھا اور اسے بوڑھے سے لے لیا "کیا یہ واقعی میرے لئے ہے؟" بوڑھے نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ یقیناً تم اس سردی میں بیمار ہو جاؤ گے۔ یہ سوئیٹر تمہیں کافی گرم رکھے گا۔"

لڑکے نے بے چوں چرا پھٹی ہوئی قمیض پر سوئیٹر پہن لیا۔

"واہ! یہ تم پر کتنا اچھا لگ رہا ہے! کیا یہ تمہیں پسند آیا؟"

"ہاں، یہ بہت خوبصورت ہے، اللہ آپ کو اس کا اجر دے۔"

"اچھا خدا حافظ!"

مڑنے سے قبل لڑکا چند لمحے ہچکچایا، پھر اس نے بوڑھے سے کہا۔

"مجھے بیلچہ دیجئے، تاکہ میں یہ پھیلی ہوئی برف صاف کر دوں۔"

بوڑھے نے سوچا کہ سوئیٹر کے عوض لڑکا اس کے لئے کچھ اور خدمت انجام دینا چاہتا ہے۔

"یہ ضروری نہیں ہے، تم اس برف کو پڑا رہنے دو، اس سوئیٹر کے لئے تمہیں کچھ اور نہیں کرنا ہوگا۔"

مجھے زیادہ دیر نہیں لگے گی، صرف دس منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔" لڑکے نے پرزور اصرار کیا۔

بوڑھے نے لاکھ منع کیا لیکن لڑکا نہ مانا۔ بالآخر تھک ہار کر اس نے لڑکے کو برف ہٹانے کی اجازت دے دی۔

ایک گھنٹے بعد دھوپ خاصی پھیل گئی۔ تو بوڑھے نے سردی سے بچنے کے لئے لمبا اوور کوٹ پہنا، پھر چادر کو اپنے اطراف اچھی طرح لپیٹا۔ اب صرف اس کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں ــــــ وہ خریداری کے لئے بازار جانے کے لئے تیار ہوا تھا۔ بیرونی دروازے سے وہ نکل ہی رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر باغ کی جانب اٹھ گئی۔ وہ لڑکا زمین پر بے سدھ پڑا ہوا تھا ــــــ وہ فوراً بھاگ کر اس کے نزدیک گیا اور اس کی نبض دیکھنے لگا۔ وہ لڑکا سردی کی شدت سے برف ہٹاتے ہٹاتے مر چکا تھا۔ اس نے سوئیٹر کی قیمت اپنی موت سے چکا دی تھی ■

افشاں بشیر

شادی کا جھگڑا

صدف :۔ چلو ملیحہ رچائیں شادی تمہاری گڑیا ہمارا گڈا
ملیحہ :۔ نہیں صدف جی کبھی نہیں جی تمہاری گڑیا ہمارا گڈا
صدف :۔ مجھے ہے گڑیا سے ایسی الفت جدا نہ اس کو میں کر سکوں گی
جو تم ہو سچ مچ میری سہیلی تمہاری گڑیا ہمارا گڈا
ملیحہ :۔ مجھے بھی گڑیا ہے میری پیاری بہت ہی بھولی بہت نیاری
جدا نہ اس کو میں کر سکوں گی تمہاری گڑیا ہمارا گڈا
صدف :۔ تمہارے گڈے کا قد ہے چھوٹا ہوا ہے کھا کھا کے خوب موٹا
ہے میری گڑیا حسین و بھولی تمہاری گڑیا ہمارا گڈا
ملیحہ :۔ تمہارا گڈا تو سانولا ہے کہاں سجے گا وہ دولہا بن کر
ہے میری گڑیا حسین و گوری تمہاری گڑیا ہمارا گڈا

صدف: ۔ ہے میرے گڈے کے پاس کوٹھی بہت ہی پیاری بہت بڑی سی
کروں گی گڑیا کے نام کوٹھی تمہاری گڑیا ہمارا گڈا
ملیحہ: ۔ ہے میرے گڈے کے پاس بنگلہ ہے میرا گڈا بڑا منسٹر
تمہاری گڑیا مزے کرے گی تمہاری گڑیا ہمارا گڈا
صدف: ۔ اگر کرو گی تم ایسے نخرے تو روٹھ جاؤں گی تم سے بالکل
تمہیں اگر دوستی ہے رکھنی تمہاری گڑیا ہمارا گڈا
ملیحہ: ۔ جو روٹھنا ہے تو روٹھ جاؤ مجھے بھی کوئی نہیں ہے پروا
جو تم کو منظور ہے یہ شادی تمہاری گڑیا ہمارا گڈا
صدف: ۔ میں اپنی گڑیا کی شادی کیسے تمہارے گڈے سے کر سکوں گی
ہے میری گڑیا ابھی تو چھوٹی تمہاری گڑیا ہمارا گڈا
ملیحہ: ۔ صدف نہ اتنا بڑھاؤ جھگڑا کریں ہم آپس میں وٹہ سٹہ
ہماری گڑیا تمہارا گڈا تمہاری گڑیا ہمارا گڈا
صدف: ۔ ہماری گڑیا تمہارا گڈا تمہاری گڑیا ہمارا گڈا

مزید محنت کی ضرورت ہے

ناقابل اشاعت تحریروں کا کالم

"قائداعظم اور پاکستان" (؟) "نیا سال" سہیل احمد ثاقب، کراچی۔ "ٹائم ٹریولر" منصور احمد مگسی، جیکب آباد۔ علاؤالدین خلجی۔ عظیم اختر میمن، میرپور خاص۔ "خدمت خلق" فدا محمد قمر، حویلیاں۔ "حضرت عمر بن عبدالعزیز" "بے نیاز مجاہد" سید غلام مصطفیٰ شاہ، لاہور کینٹ۔ "سزا" ممتاز الدین احمد، کراچی۔ "مغرور شہزادی" ایم بی، بہاول نگر۔ "نیک بنو" وکیل احمد خان، بہاول نگر۔ "بلاعنوان" امجد اسلام، ایبٹ آباد۔ "آنکھ مچولی" محمد سلیمان (؟) "نعت" عطاء اللہ سوہو، لاڑکانہ۔ "بڑا دکھ" محمد مدثر مدنی، ضلع جہلم۔ "محمد علی جناح" عطاء الرحمٰن بلوچ، تمپ۔ "بوڑھیا اور سلطان" ساجد صبا باغبازاری، پسنی۔ "پیارے پاکستان" نثار احمد بلوچ، پنجگور۔ "نائٹ کلب آف جنات" نثار احمد بلوچ، پنجگور۔ "نادان صبیح" سیدہ غزالہ افروز، کراچی۔ "علم کی پری" صائمہ وفا، کراچی۔ "اف یہ سادگی" (؟) "جادو کے منکے" سیمار حمان، پشاور۔ "جلد بازی کے کرشمے" (؟) "کنجوس تاجر اور شیخ چلی" ضیغم عباس، حیدر آباد۔ "کتاب" اشفاق احمد جنجوعہ، منڈی بہاؤالدین۔ "جاسوس" شیراز طاہر، ایبٹ آباد۔ "ہم بیمار کیوں ہوتے ہیں" شاہد فاروق، مخدوم پور۔ "شرمندہ غزل" "اب بولو بچو!" روبینہ کوثر، منگلا۔ "تیسری گولی" "دھرتی ماں" اصغر علی ساگر، مردان "گاڑی" فرقان علی راجپوت، ٹمیاری۔ "آنکھ مچولی" ہما شریف، کراچی۔ "سیاح اور بندر کی دوستی" محمد ابراہیم، کراچی۔ "قصور وار کون" محمد عثمان صدیقی، کراچی۔ "نیکی کا صلہ" محمد عثمان، کراچی۔ جادو کی ہنڈیا۔ فہد ظفر، لاہور۔ "غرور اور نافرمانی کی سزا" "انجام" "علم" معذ عباس، کراچی۔ "ایاز کی خوبی" صوفیہ سلطان، کراچی۔ "آج کا انسان" رانا محمد راشد، ساہیوال۔ "میرے خدا نے" "حقوق اطفال" زاہد حسین ابڑو، (؟)۔ "شوق" صبا ستار، لاہور۔ "ہیرا اور پولیس" ہیرا شمس، کراچی۔ "کشمیر بنے گا پاکستان" فضل عباس شاہ، شور کوٹ۔ "ٹارچ کا بھوت" حسین علی آرائیں، اٹک۔ "کمانڈوز ایکشن" سید الیاس حسین، کراچی۔ "محب وطن" محمد وسیم صادق، رحیم یار خان۔ "ظالم بادشاہ" محمد ریاض لاشاری، جیکب آباد۔ "شرارتی بندر" ش۔ ر بلوچ، کنری "نوجوان شہید" محمد عتیق الرحمان، فیصل آباد۔ "ڈرائنگ شیٹ" محمد نفیس تبسم، آزاد کشمیر۔ "خاموشی" فرحین طاہر شمسی، کراچی۔ "قبرستان" کوثر فاطمہ رضوی، ایبٹ آباد۔ "چمکتا یہ ایک تارا ہے۔" ذکاء الدین، کامرہ۔ "سلفر" سید محمد رضا جعفری، کراچی۔ "زلزلہ رک گیا" سید قاسم مجتبیٰ، لاہور۔ "جی چاہتا ہے" محمد لقمان ساغر، لاہور کینٹ۔ "ہماری مس" شازلی مسعود، ڈیرہ اسماعیل خان۔ "قصور کس کا" محمد اویس خان یوسف زئی، اٹک۔ "پیارا وطن" فرحان محمد حسین، کراچی۔ "چالاک بیوی" حضرت اقبال، کراچی۔ "میری پیاری دادی" "بھیگتی چڑیا" سیدہ ایلیہ رضوی، کراچی۔ "جنی اور کئی" شیر نواز گل، پشاور۔ "جواہرات" امجد اقبال، گجرات۔ "نظم" "نعت" محمد عاطف معروف (؟) "سچائی کا راستہ" صائمہ محمود، کراچی۔ "جن کے کارنامے" فراز احمد، حیدر آباد۔ "سونے کی مورتی" عامر علی شاہ، لاہور۔ "اور ہم نے کہانی لکھی" نسیم نیازی، فیصل آباد۔ "ضد کی سزا" عامر شہزاد تبسم، جہلم "دانا نوکر" سیدہ کاشفہ، کراچی۔

آمنے سامنے

اسٹار کھلاڑیوں سے سوال جواب کا دلچسپ سلسلہ

سلیم خالق

اسنوکر کے عالمی چیمپئن محمد یوسف کے نام بچوں کے بہت سے خطوط آئے۔ محمد یوسف سے جب کراچی کلب میں ملاقات ہوئی تو اندازہ ہوا کہ وہ بچوں کو خاصا پسند کرتے ہیں۔ محمد یوسف نے کوشش کی ہے کہ بچوں کے خطوط کے جوابات بچوں کے پسندیدہ اسٹائل سے ہی دیئے جائیں۔

س ...... یوسف انکل کیا کبھی آپ کی کسی چڑیل آنٹی یا بھوت چاچا سے ملاقات ہوئی ہے؟ (عرفان محمد حسین، کراچی)

محمد یوسف ...... عرفان بھیا، اللہ کا شکر ہے کہ ابھی تک کسی الٹے پیروں والی عورت (جس کی شکل نہایت خراب ہو) سے تو میری ملاقات نہیں ہوئی ہے، مگر ایک بات ہے کہ میرا گھر ایک عمارت کی پانچویں منزل پر ہے۔ جب میں رات کو بارہ بجے کے قریب اپنے گھر واپس پہنچتا ہوں تو عمارت کے ہر فلور پر ایک خطرناک کالی بلی میرا استقبال کرتی ہے۔ جس کو دیکھتے ہی میری حالت خراب ہو جاتی ہے اور میں ڈرتا ڈرتا اپنے گھر پہنچتا ہوں، اس وقت

میری سوچ یہی ہوتی ہے کہ اب یہ بلی چڑیل میں تبدیل ہو جائے گی، مگر شکر ہے ایسا نہیں ہوا ہے، ویسے آپ بھی بلیوں سے احتیاط کر کے چلا کریں۔

س...... یوسف بھائی! اگر مجھے آپ سے آٹوگراف لینا ہو اور میرے ہاتھ میں آٹوگراف بک کے بجائے اسنوکر کی گیند ہو اور قلم کی جگہ "چاک" ہو تو کیا آپ مجھے آٹوگراف دینا پسند کریں گے؟ (محمد عبدالرحیم، ملتان)

محمد یوسف...... محمد عبدالرحیم بھائی، میں ضرور آپ و آٹوگراف دوں گا بشرط گیند آپ کی اپنی ہو اور یاک اس پر لکھ سکے۔

س...... انکل یوسف جب آپ اسنوکر کے عالمی یمپئن بنے تو اس وقت آپ کے کیا تاثرات تھے؟ نوید ہاشمی، کراچی۔ احتشام ہاشمی، کراچی۔ مان ہاشمی، کراچی۔ عابد حسین چانڈیو، لاڑکانہ۔ صمد عمر، کراچی۔ میر عبدالقادر عباس، لاڑکانہ۔ خالد احمد پاشا، کراچی۔ حماد عثمانی، کراچی)

محمد یوسف...... اس وقت میں بہت خوش تھا۔ آپ کو بھی خوش ہونا چاہئے۔ بچوں کو یہ سوچنا چاہئے کہ اپنے وطن کے لئے کوئی کارنامہ انجام دیں۔

س...... آپ تو بالکل چھپے رستم نکلے۔ ایک دم سے عالمی چیمپئن بن گئے۔ مگر آپ پہلے کہاں تھے اور اچانک عالمی چیمپئن کیسے بن گئے؟ (شیخ علی رضا قمر، پتوکی)

محمد یوسف...... چھپے رستم کے لفظ کا تو آپ نے بہت اچھا استعمال کیا ہے، مگر میں چھپا ہوا نہیں تھا۔ میں کافی عرصے سے اسنوکر کے کھیل سے وابستہ تھا۔ گزشتہ سات آٹھ سال سے بہت مشہور بھی ہوں تو بھلا میں چھپا رستم کیسے ہوا۔

س...... یوسف بھائی! اسنوکر کھیلنا آپ نے کس سے سیکھا؟ (شہر بانو بخاری، رحیم یار خان۔ محمد عظیم قریشی، اسلام آباد۔ عابد علی عباسی، لاڑکانہ)

محمد یوسف...... میری یہ بدقسمتی تھی کہ میرے زمانے میں یہ کھیل سکھایا نہیں جاتا تھا اس لئے میں کسی سے سیکھ نہیں سکا، مگر جن حالات میں، میں نے اسنوکر کھیلنا سیکھا ہے، یہ ایک بہت لمبی داستان ہے کبھی اگر ملاقات ہوئی تو آپ کو بتاؤں گا۔

س...... یوسف بھائی اب جب کہ آپ اسنوکر کے عالمی چیمپئن ہیں، آپ کے کیا تاثرات ہیں؟ (سیدہ

حنانورین کاظمی، کراچی۔ صائمہ، سمیرا، کراچی۔ سوتی خان، اٹک۔ سید صولت علی جعفری، حیدر آباد۔ مسعود احمد سومرو، گڈو)

محمد یوسف...... ہر انسان کو جو اپنے، ملک کے لئے کوئی کارنامہ انجام دے تو اسے خوش ہونا چاہئے میں بھی بہت خوش ہوں۔ آپ لوگوں کی صحبت نے اس خوشی کو اور زیادہ بڑھا دیا ہے۔ بس اب دعا کریں کہ آئندہ بھی آپ لوگوں کی توقعات پر پورا اتروں۔

س...... عالمی چیمپئن بننے کے بعد اخبارات میں آپ کے جو تاثرات شائع ہوئے ہیں میں نے ان سے یہ اندازہ لگایا ہے کہ آپ کو جو مقام ملنا چاہئے تھا۔ پاکستان والوں نے وہ مقام آپ کو نہیں دیا، کیا آپ میری اس رائے سے متفق ہیں؟ (عالم شفیع ہمدم، جھنگ۔ عمران سہیل بوبی، اوکاڑہ)

محمد یوسف...... آپ کے سوال سے مجھے لگتا ہے کہ آپ کو مجھ سے بہت ہمدردی ہے۔ مگر بھائی میرے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں ہوا، مجھے لوگوں نے بہت سراہا بہت عزت دی، اور مجھے بہت کچھ ملا، میرے دل میں کسی کے لئے کچھ نہیں ہے، انشاء اللہ مجھے یقین ہے کہ میں نے جو اپنے وطن کے لئے کام کیا ہے اس کا مجھے اور صلہ ملے گا، حکومت بھی دے گی آپ لوگوں کی صحبتیں تو مجھے مل ہی رہی ہیں میں بہت زیادہ مطمئن ہوں اور اللہ کا شکر گزار ہوں۔

س...... ورلڈ کپ فائنل کھیلتے وقت آپ کی کیا حالت تھی؟ اپنا ایڈریس مجھے دیں؟ (تہمینہ حنیف، شیخوپورہ۔ ادیس یوسف زئی، اٹک)

محمد یوسف...... اس وقت بہت زیادہ ٹینشن تھی۔ ظاہری بات ہے ٹینشن تو ہوتی ہی تھی۔ آخر ورلڈ کپ کا فائنل چل رہا تھا۔ ایڈریس لے کر کیا کریں گے، آپ کے خطوط تو ہم کھلاڑیوں تک پہنچ ہی جاتے ہیں۔

س...... انکل یوسف! آپ قبرستان سے گزر رہے ہوں، اتنے میں ایک مردہ قبر سے اٹھ کر آپ کے پاس آئے اور کہے کہ یوسف میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔ مگر اگر تم بچنا چاہتے ہو تو مجھ سے اسنوکر کا میچ کھیلو اگر تم جیت گئے تو جان بخشی اور اگر ہار گئے تو......؟ اس وقت آپ کیا کریں گے؟ (محمد رحمت اللہ بشیر قادری، گجرات)

محمد یوسف...... پہلے تو میں بھوت بھیا سے التجا کروں گا کہ بھوت بھیا مجھے چھوڑ دیں جانے دیں ورنہ یہ نہ ہو کہ آئندہ جب بھی میں کسی سے اسنوکر کھیلوں تو وہ یہ کہے کہ نہ بھئی نہ اس کے ساتھ نہیں کھیلنا یہ تو بھوتوں کے ساتھ کھیلتا ہے، لیکن اگر پھر بھی وہ نہ مانیں تو ان سے کھیلنا پڑے گا، مگر ان سے کھیلنے میں بہت لطف آئے گا۔

س...... یوسف بھائی آپ ورلڈ چیمپئن بن گئے مگر پی ٹی وی نے آپ کے ساتھ بڑی زیادتی کی اب تک ورلڈ کپ چیمپئن کے میچز کی ریکارڈنگ نہیں دکھائی؟ (شاہینہ علی بخاری، رحیم یار خان)

محمد یوسف...... پی ٹی وی ورلڈ کپ کے میچز کی

ریکارڈنگ دکھانے کے لئے اپنی کوشش تو کر رہا ہے، انشاء اللہ جلد ہی وہ کیسٹ آ جائے گی تب آپ آرام سے میچز دیکھئے گا۔

س...... یوسف صاحب جب آپ ورلڈ کپ جیت کر وطن واپس آئے تو کیا اس وقت آپ کا استقبال بھی ہاکی اور کرکٹ کے کھلاڑیوں کی طرح کیا گیا؟ (عبدالقدیر انڈھڑ، پنو عاقل)

محمد یوسف ...... چھوٹے بھیا، میں سمجھتا ہوں کہ میرے وطن کی سرزمین پر پہنچنے کے بعد جتنا استقبال ہوا اتنا شاید ہی کسی کا ہوا ہو، مجھے تو یوں لگ رہا تھا جیسے میں کسی قوم کا کوئی لیڈر ہوں اور پورا جلوس میرے ساتھ جا رہا ہو۔ میں یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا کہ ملک میں اسنوکر کے چاہنے والے بھی موجود ہیں۔

س...... کیا آپ کو یقین تھا کہ آپ عالمی چیمپئن بنیں گے؟ (نوید ہاشمی، نعمان ہاشمی، کراچی۔ احتشام ہاشمی، کراچی)

محمد یوسف...... یقین دل میں تھوڑا بہت تھا کہ میں یہ کارنامہ انجام دے سکوں گا، خود اعتمادی اچھی چیز ہوتی ہے، ہمیشہ حوصلہ رکھنے والے لوگ ترقی کرتے ہیں۔ آپ کو بھی اپنے وطن، اپنے ماں، باپ، بہن، بھائیوں کے لئے حوصلہ سے ہر کام کرنا چاہئے۔

س...... یوسف بھائی فرض کریں کہ ایک جن آپ کے پاس آئے اور آپ سے کہے کہ "یوسف تم مجھے اپنا سارا تجربہ اور اسنوکر کی مہارت دے دو اس کے بدلے میں تمہیں منہ مانگی رقم دوں گا تو آپ کیا کریں گے؟ (شیخ مبشر عباس، شیخوپورہ)

محمد یوسف ...... میں جنوں سے بہت ڈرتا ہوں۔ اسی لئے فوراً ان کی بات مان لوں گا اور بدلے میں ان سے بہت سی رقم لے لوں گا۔

س...... اسنوکر اور بلیرڈ میں کیا فرق ہے؟ (شہریار علی بخاری، رحیم یار خان)

محمد یوسف ...... اسنوکر کے کھیل میں ۲۲ گیندیں ہوتی ہیں جن میں ۱۵ لال ہوتی ہیں ۶ دوسرے رنگ کی اور ایک گیند سفید ہوتی ہے جو اسٹرائیکر کہلاتی ہے۔ بلیرڈ کے کھیل میں ۳ گیندیں استعمال ہوتی ہیں دو سفید اور ایک لال۔

س...... آپ عالمی چیمپئن بننے کے بعد قومی چیمپئن شپ میں صالح محمد سے ہار گئے۔ اس کی کیا وجہ تھی؟ (سعد نوید، لاہور۔ احمد فرقان، ملتان۔ فیصل رحمان، فیصل آباد)

محمد یوسف ...... صالح محمد پاکستان کا نمبر ایک نامور کھلاڑی ہے، اور انسان ہمیشہ تو نہیں جیت سکتا ہے کبھی نہ کبھی ہار تو ہوتی ہے، آپ ہمیشہ ایک بات یاد رکھئے کہ اگر آپ جیت کو زیادہ اہمیت دیں گے تو ہار آپ کو کبھی برداشت نہیں ہوگی۔ اس لئے ہار سہنے کا بھی حوصلہ رکھئے انشاء اللہ جیت آپ کا مقدر ہوگی۔

آمنے سامنے کے آئندہ مہمان
ٹیبل ٹینس کے کھلاڑی
عارف ناخدا اور ناز وشکور ہوں گے

عینک والا جن

محمد رافع

"دادو پلیز! ذرا آہستہ باتیں کر لیں نا امی سے۔ مجھے نسطور انکل کے الفاظ صحیح طرح نہیں سنائی دے رہے۔" راشد نے اپنی دادی ماں سے کہا۔

"توبہ ہے!! یہ لڑکا تو اس لمبوترے جن کا عاشق ہی ہو گیا ہے۔ جب دیکھو ٹی وی پر یہی چل رہا ہے، اسی کی باتیں ہو رہی ہیں۔" دادی بڑبڑائیں۔ اور تو اور امی بھی راشد کی خبر لیتی ہوئی بولیں۔ "یہ تو راحیلہ کو بھی بل بتوڑی کہتا ہے۔ پھر کبھی اس سے کوئی کام کروانا ہو تو تعریف بھی ایسی کی جاتی ہے کہ "چڑیل نہیں تو ڈائن ہے میری پیاری بہن ہے۔"

"میں تو کہتا ہوں باجی کہ آخر اس سائنسی دور میں ایسے ڈرامے دکھانے کا کیا مقصد؟" ظہیر ماموں بھلا کیسے چپ بیٹھے رہ جاتے۔ "پی ٹی وی والے پتہ نہیں کس صدی میں جی رہے ہیں۔ مغربی ممالک کے ڈرامے بچوں کو خلائی زندگی کی جھلک دکھا رہے ہیں اور یہاں ابھی تک ایک حضرت جو کسی نئے میک اپ مین کی غلطیوں کا نشانہ بنے لگتے ہیں، ہواؤں میں اڑے چلے جا رہے ہیں حالانکہ ان کا وجود اتنا بھاری ہے کہ وہ زمین پر ہی بہ مشکل چلتے ہیں۔"

ظہیر ماموں کی بات پر سبھی مسکرانے لگے سوائے راشد کے۔

"آپ لوگ یہ ساری بحث آج ہی نہ ختم کر دیجئے گا بلکہ کچھ عین اس وقت کے لئے بھی اٹھا رکھئے جب اگلے ہفتے میں اگلی قسط دیکھوں۔" راشد بے بسی سے بولا۔ آخر سب اپنے اپنے

کاموں میں لگ گئے اور وہ پلکیں جھپکائے بغیر "عینک والا جن" دیکھنے لگا۔

اسلم صاحب کے دونوں بچے راشد اور راحیلہ پڑھائی میں بہت تیز تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ عام والدین کے برعکس اس معاملے میں بالکل بے فکر تھے۔ دونوں بچے کھانا کھاتے ہی ہوم ورک کرتے، ٹیسٹ وغیرہ کی تیاری کرتے اور پھر راحیلہ تو اپنی کسی سہیلی کے گھر چلی جاتی اور راشد ٹی وی کی طرف دوڑتا۔ اور جب سے "عینک والا جن" شروع ہوا تھا تو اس کا شوق جنون کی حد تک بڑھ گیا تھا۔ ہفتے میں باقاعدگی سے دیکھنے کے علاوہ وہ اپنے دوست سے اس ڈرامہ کی ریکارڈ کردہ ویڈیو کیسٹ بھی لے آیا تھا۔ بس ادھر کام ختم ہوا اور ادھر وی سی آر پر عینک والا جن کی کیسٹ چلا دی جاتی۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کے بعد پورے گھر کو راشد کے ڈائیلاگ بھی سننا پڑتے۔

راحیلہ کو کہتا۔ "بل بتوڑی، ناساں چوڑی آدھی مٹھی ادھی کوڑی" وہ امی کو بتانے کے لئے اٹھتی تو فوراً کہتا۔ "آئی ایم سوری۔ آئی ایم سوری۔" کبھی امی کی انگوٹھی پہن کر اسے طلسمی تصور کرتا اور کبھی ڈائننگ ٹیبل پر کھانے کی مختلف ڈشیں دیکھ کر امی سے کہا۔ "میں کس کو کھاؤں ہہیں کس کو کھاؤں؟" کبھی گھر کے کسی کونے سے "زیمینا - زیمینا" کی آوازیں گونجتیں اور کبھی ابو کی عینک غائب ہوتی۔

لیکن کیونکہ راشد کسی جن کا بچہ نہیں تھا بلکہ اچھے بھلے شریف انسان (اپنے اسلم صاحب مراد ہیں) کا بچہ تھا اس نے مسلسل ٹی وی دیکھنے سے اس کی بینائی تو متاثر ہونی ہی تھی۔ شروع میں تو راشد کو احساس ہی نہیں ہوا بلکہ وہ تو چیزوں کے غائب ہونے کو اپنا طلسماتی کرشمہ سمجھ رہا تھا۔ امی ابو کو بھی اس وقت پتہ چلا جب اسکول کی پرنسپل صاحبہ نے اس امر کی طرف توجہ دلائی۔ پھر کیا تھا ابو اسی وقت راشد کو اپنے ایک دوست ڈاکٹر کے پاس لے گئے اور مختلف ٹیسٹوں کے بعد اگلے ہی دن اس کی آنکھیں دو موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے سے جھانک رہی تھیں۔ ابو اور راشد گھر میں داخل ہوئے تو راحیلہ کو تو جیسے پچھلے سارے بدلے اتارنے کا موقع مل گیا۔ وہ اسے "عینک والا انسان" کہہ کر بلانے لگی تھی۔ راشد جو پہلے ہی عینک لگنے کی وجہ سے بیزار سا تھا اس نئی صورت حال سے بالکل ہی ٹوٹ کر رہ گیا۔ اب اسے احساس ہوا کہ مذاق اڑانا کتنا آسان لیکن مذاق سہنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ اسے یاد آرہا تھا کہ وہ راحیلہ کو "بل بتوڑی" کہہ کہہ کر اس کا مذاق اڑاتا رہتا تھا لیکن جب راحیلہ نے اسے "عینک والا انسان" کہا تو اسے برداشت کرنا مشکل ہو گیا اور وہ راحیلہ سے جھگڑ پڑا تھا پھر ایک دفعہ ظہیر ماموں اس کے "عینک والا جن" دیکھنے پر گنگنانے لگے۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ اگرچہ وہ سمجھ نہ سکا کہ انہوں نے کیا کہا لیکن طنز کا اشارہ واضح تھا دو چھوٹے چھوٹے قطرے اس کی آنکھوں سے ڈھلک گئے۔

اسکول میں بھی سب دوست اسے "چشماٹو" کہہ کر پکارتے اور پھر خوب ہنستے۔ آہستہ آہستہ راشد سب سے الگ ہوتا گیا۔ وہ جو پہلے پڑھائی میں بہت تیز تھا اب کتابوں کے نام سے ہی بدکنے لگا تھا۔ سب کچھ چھوڑ کے اس نے اپنی ایک الگ دنیا بسالی تھی۔ ایک ایسی دنیا جہاں اس کے نسطور انکل ہر وقت اس کے ساتھ رہتے تھے۔

"اجی سنتے ہیں! آج بچوں کا رزلٹ آیا ہے اسکول سے۔" امی نے ابو سے کہا۔

"اچھا۔ مگر اس مرتبہ آپ نے منہ میٹھا نہیں کروایا۔" اسلم صاحب بدستور اخبار پڑھتے ہوئے بولے۔

"میٹھا تو نہیں البتہ اس مرتبہ آپ کا منہ کڑوا ضرور ہو جائے گا۔ کیونکہ راحیلہ تو ماشاء اللہ فرسٹ آئی ہے مگر آپ کے لاڈلے کی بارھویں پوزیشن آئی ہے۔" امی افسردگی سے بولیں۔

"کیا۔؟! بارھویں پوزیشن اور راشد کی۔" اسلم صاحب نے چونک کر اخبار ہٹاتے ہوئے کہا۔ "کیا وجہ ہو سکتی ہے اس کی؟ آخر اسکول سے واپس آکر کیا کرتا رہتا ہے؟" اسلم صاحب جو بچوں کی پڑھائی کی طرف سے بالکل بے فکر رہتے تھے آج پریشانی ان کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ "کتابیں تو کھولے بیٹھا رہتا ہے لیکن وہ توجہ اور لگن ختم ہو گئی جو کبھی وہ کیا کرتا تھا۔ بس کھویا کھویا سا رہتا ہے کچھ پوچھو تو بتاتا بھی نہیں۔"

"اچھا بلاؤ اس کو ابھی دیکھ لیتے ہیں۔" اسلم صاحب سخت لہجے میں بولے۔

اتنے میں دروازہ کھلا اور ظہیر ماموں داخل ہوئے "کس کو بلانے کی بات ہو رہی ہے۔ ہم تو بن بلائے ہی چلے آتے ہیں۔" ان کی آمد سے راشد کا معاملہ کچھ دیر کے لئے ٹھنڈا پڑ گیا۔ ظہیر اپنے کالج میں ڈرامیٹک کلب کے ممبر تھے اور اپنی پرفارمنس پر کئی انعامات بھی جیت چکے تھے۔ ہر جمعرات کو وہ باجی اور بچوں سے ملنے ضرور آتے۔ بچوں کے لئے کافی ٹافیاں اور چاکلیٹ لاتے تھے اس لئے راشد اور راحیلہ دونوں ہی ان کا انتظار کرتے مگر راشد کا رویہ پچھلے ہفتے سے تبدیل ہو رہا تھا۔

اسلم صاحب نے ظہیر ماموں کو بھی ساری تفصیل سنائی۔ "ابھی تمہارے آنے سے پہلے ہم اسی مسئلے پر بات کر رہے تھے۔"

"بھائی جان ایک بات تو طے ہے کہ سختی سے کام نہیں چلے گا۔ ہمیں اس کی شخصیت کا تجزیہ کرنا چاہئے۔ میرا خیال ہے کہ کچھ عرصہ پہلے جب راشد کی بینائی صحیح تھی تو ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ کہیں چشمہ لگنے کی وجہ سے تو............ اوہ ہاں...... بالکل!! یہی وجہ ہو سکتی ہے۔"

"کیا تمہارے خیال میں یہ وجہ معقول ہے۔" اسلم صاحب متفق نظر نہ آتے تھے۔

"ہاں بھائی جان...... دراصل اسے چشمہ لگنے کے بعد ہمارے رویوں میں کسی حد تک تبدیلی آئی جس

کا وہ عادی نہ تھا۔ ایسا ہی کچھ معاملہ اس کا دوستوں کے ساتھ بھی ہوا۔ اچھا یہ بتایئے کہ کوئی دوست آیا اس سے ملنے؟"

"بس عینک والا جن آتا ہے ہر ہفتے۔" راحیلہ بے ساختہ بولی۔

"لیجئے مسئلہ ہی حل ہو گیا۔ کڑی سے کڑی مل گئی۔" ظہیر ماموں بولے۔ "اب باقی ذمہ داری میری۔"

"ہمیں کچھ نہیں بتاؤ گے۔" باجی ناراض ہوتے ہوئے بولیں۔

"او کے بتاتا ہوں آپ کو کریں گے ہم یہ کہ ..." اور پھر تفصیلات طے ہونے لگیں۔

راشد اکیلا بیٹھا ہوا عینک والا جن دیکھ رہا تھا۔ امی ابو شادی میں گئے ہوئے تھے۔ راحیلہ اپنی سہیلی نجمہ کی طرف گئی ہوئی تھی اور ظہیر ماموں اور فضلو بابا نیچے کچن میں تھے۔ اچانک لائٹ چلی گئی تاریکی اتنی گہری تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجائی نہ دیتا تھا۔

"فضلو بابا گیس لیمپ جلا دیں۔" راشد زور سے بولا۔ کوئی جواب نہ پا کر وہ اور زور سے چلایا۔ "فضلو بابا...... فضلو بابا......" لیکن دوسری طرف بدستور خاموشی تھی۔ راشد کا دل دھڑکنے لگا۔ اس قسم کی صورت حال سے اس کا واسطہ پہلی مرتبہ پڑا تھا۔ ہر سو اندھیرا، تاریکی اور ایک بے رحم سی خاموشی۔ اچانک اپنے پیچھے اسے روشنی کا احساس ہوا اس نے گھوم کر دیکھا تو اس کا دل گویا دھڑکنا بھول گیا۔ اس کے سامنے اس کے دوست انکل نسطور کھڑے تھے۔

"آپ ...... آپ ...... انکل نسطور ہیں نا!" اس لمحاتی کیفیت سے نکلنے کے بعد راشد نے پوچھا۔ خوشی اس کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ لیکن ایک خیال ایک سوچ کی لہر اس کے دماغ میں اٹھ رہی تھی کہ انکل اتنے خوفناک تو نہیں تھے وہ تو بڑا پیار کرنے والے دوست تھے۔

"ہاہاہا— ہم گل طور ہیں دوست۔ نسطور کے بڑے بھائی۔" ایک آواز راشد کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس ماحول میں جہاں ہر طرف تاریکی کا راج تھا گل طور کے چہرے پر پراسرار سی روشنی پڑ رہی تھی اس روشنی نے اس کے چہرے کے نقوش کو اور بھیانک بنا دیا تھا۔ وہ سیاہ لباس میں ملبوس تھا اور طلسمی مالائیں اس کے گلے میں جھول رہی تھیں۔

"ہمیں بتایا جائے کہ ہم کہاں ہیں ہم تو نسطور کو ساتھ لے جانے کے لئے ٹی وی اسٹیشن کی طرف محو پرواز تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اس اڑن کھٹولے کے پلگ میں کچرا آ گیا اور اس نے ہمیں درمیان میں ہی اتار دیا۔" گل طور بولا۔ "لو بھائی راشد تمہارا بڑے باتونی جن سے واسطہ پڑا ہے۔" راشد بڑبڑایا پھر گل طور سے کہا۔ "آپ اسلم لطیف ایڈووکیٹ کے گھر نازل ہوئے ہیں۔ انکل آپ مجھے نسطور انکل کے پاس لے چلیں۔ وہ میرے دوست ہیں۔ اور میں نا روزانہ تین چار گھنٹے ان کا ڈرامہ دیکھتا ہوں۔"

"چپ ہو جا گستاخ!" گل طور گرجا اور دور

کہیں چڑیلوں کے چیخنے کی آوازیں آنے لگیں۔ راشد بھی ایک دم سہم گیا۔ "اتنی دیر تو منسطور خود اپنا پروگرام نہیں دیکھتا۔ اس کا مطلب ہے تم ایک نالائق لڑکے ہو زیادہ ٹی وی دیکھتے ہو جبکہ مجھے اور منسطور کو وہی بچے اچھے لگتے ہیں جو کام زیادہ کریں۔ " گل طور بدستور غصے میں بولا۔ "ہمیں تمہاری دوستی منظور نہیں دور ہو جاؤ ہماری نظروں سے۔ "

"جائیے چلے جائیے آپ بھی۔ " آنسو راشد کے رخساروں پہ بہہ رہے تھے۔ "آپ بھی اڑائیے میرا مذاق دوسروں کی طرح۔ کہئے مجھے چشما ٹو یا عینک والا انسان۔ " شدت جذبات سے راشد کی آواز رندھ گئی۔ " ایک انکل منسطور تھے جن سے میں ساری باتیں کرتا اس یقین کے ساتھ کہ وہ ضرور میری مدد کریں گے لیکن آج آپ آئے بھی تو۔ " راشد بے طرح سسکیاں لینے لگا۔

"ہم تمہاری مدد ضرور کریں گے۔ "گل طور سارا معاملہ سمجھ کر بولا۔ "یہ لو طلسمی پین۔ اگر تم روزانہ ہر سبق چار مرتبہ اس کے سامنے دہراؤ گے تو اس کے اندر بیٹھا جن وہ یاد کر لے گا۔ پھر جب پرچہ دینے جاؤ تو جن کو اس کا سبق یاد دلانے کے لئے زور سے دو مرتبہ دہرائی کرو۔ بس دیکھنا یہ پین خود بخود لکھنے لگے گا۔ "

"واقعی کتنا آسان نسخہ ہے۔ " راشد پین کو دیکھنے لگا جو اندھیرے میں چمک رہا تھا۔ اس نے تشکرانہ نظروں سے گل طور کی طرف دیکھا تو حیران رہ گیا۔ "انکل آپ کی مونچھ لٹک .... "

اسی لمحے گل طور غائب ہو گیا اور پھر چند منٹوں بعد ہی لائٹ آ گئی۔

"امی ...... امی یہ لیجئے رزلٹ کارڈ حسب معمول آپ کا فرزند سب سے بلند یعنی فرسٹ۔ " راشد خوشی سے معمور لہجے میں بولا۔ پھر سرگوشی میں کہنے لگا۔ "امی پتہ ہے یہ سب اس جادوئی پین کا کمال ہے۔ "

"افوہ پھر وہی جادو کی باتیں۔ " امی سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن رہی تھیں۔ "بیگم یہ لو مٹھائی محلے میں بانٹ دینا۔ آخر ہمارا بیٹا فرسٹ آیا ہے۔ " ابو نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"اور راشد میاں آپ کے پاس گل طور صاحب آئے اور آپ نے ہمیں بتایا بھی نہیں۔ "

راشد کی آنکھوں میں حیرت ہی حیرت عود آئی۔ "مگر ابو آپ کو کیسے پتہ چلا اس بات کا۔ میں نے تو ایک مہینے تک اس راز کو راز ہی رکھا۔"

"بات دراصل یہ ہے بیٹا کہ جنوں کی ایک ٹیم ہمارے پاس بھی ہے۔ فضلو راحیلہ، اور ظہیر چلو باہر نکلو۔ " راشد حیرت کے سمندر میں غوطہ کھا رہا تھا۔ ادھر فضلو بابا، ظہیر ماموں اور راحیلہ آ موجود ہوئے وہ سب خاموش تھے مگر ان کے چہرے مسکرا رہے تھے۔

"لو بیٹا۔ ملو اپنے گل طور جن سے۔ " ابو نے ظہیر ماموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

کہا۔
"ماموں آپ — آپ گل طور بنے تھے۔ مگر وہ چمکتا ہوا پین۔" راشد ابھی تک الجھن میں تھا۔
"ہاں وہ پین طلسمی نہیں تھا۔ میں نے اس پر وائٹ فاسفورس مل دی تھی جس سے وہ اندھیرے میں چمک رہا تھا۔" ظہیر ماموں نے بتایا۔ "اور — اور وہ آپ کی مونچھ۔؟" راشد چہکتے ہوئے بولا تو سب ہنس پڑے۔ ماموں کھسیانے ہو گئے۔
"وہ مونچھ اس راحیلہ کی بچی نے چپکائی تھی اس لئے تو عین وقت پر لٹک گئی تھی وہ تو شکر ہے کہ فضلو بابا نے صورت حال سمجھتے ہوئے ٹارچ بند کر دی تھی ورنہ سب کئے کرائے پر پانی پھر جاتا۔"
"راشد بیٹا۔" ابو سنجیدگی سے بولے۔
"اب تو تمہیں یقین آ گیا کہ جن اگر ہوتے بھی ہیں تو یوں سر عام ظاہر نہیں ہوا کرتے اور تم فرسٹ اس طلسماتی پین کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی محنت کے بل بوتے پر آتے۔ یاد رکھنا بیٹا کہ جادو وغیرہ سے کچھ نہیں بنتا بلکہ ہر کام انسان کی اپنی محنت سے ہوتا ہے۔"
"بالکل ابو۔ جیسے ظہیر ماموں سب کی نظریں بچا کے مٹھائی صاف کرنے میں کتنی محنت کر رہے ہیں۔" راشد نے کہا تو ظہیر واقعی ایسے ہو گئے جیسے ان کی چوری پکڑی گئی ہو اور سب کے قہقہوں سے پورا کمرہ گونج اٹھا۔

لیکن وہ جو پراسرار سی روشنی آ رہی تھی آپ کے چہرے پر وہ — وہ......؟؟" راشد سراپا سوال بنا ہوا تھا "ارے بھانجے کہاں تک سوال کرو گے لو میں سارا منصوبہ ہی تمہیں سنائے دیتا ہوں۔" ظہیر ماموں نے کہا اور راشد پر اشتیاق نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔
"تمہارے رویئے سے ہم سب پریشان تھے۔ آخر بڑی بحث کے بعد ہم نے تمہیں درست کرنے کے لئے اور کتابوں سے تمہارا رشتہ جوڑنے کے لئے ایک ایکشن پلان بنایا۔ پیر کے روز جب تم عینک والا جن دیکھ رہے تھے تو فضلو بابا نے مین سوئچ آف کر دیا۔ میں تمہارے کمرے کی کھڑکی کے باہر ہی بیٹھا تھا۔ لائٹ آف ہوتے ہی میں اندر گھس آیا۔ اس وقت میں نے اپنے ڈرامیٹک کلب سے منگوایا ہوا سامان پہن رکھا تھا۔" ظہیر ماموں نے ایک نظر سب پر ڈالی راشد کے علاوہ سبھی تفصیل جانتے تھے۔
"فضلو بابا روشن دان میں مورچہ سنبھالا اور ٹارچ کی روشنی سیدھی میرے چہرے پر فکس کر دی۔ ڈائیلاگ میں نے پہلے ہی سوچ رکھے تھے راحیلہ ٹیپ ریکارڈ کو تھامے ہوئے تھی۔ میری ہر بات کے بعد وہ ہلکی آواز میں کیسٹ آن کر دیتی جس میں چڑیلوں جیسی آوازیں بھری ہوئی تھیں۔ یہ بھی میں اپنے کلب سے لے کر آیا تھا۔"

فیشن ہے یا درگت

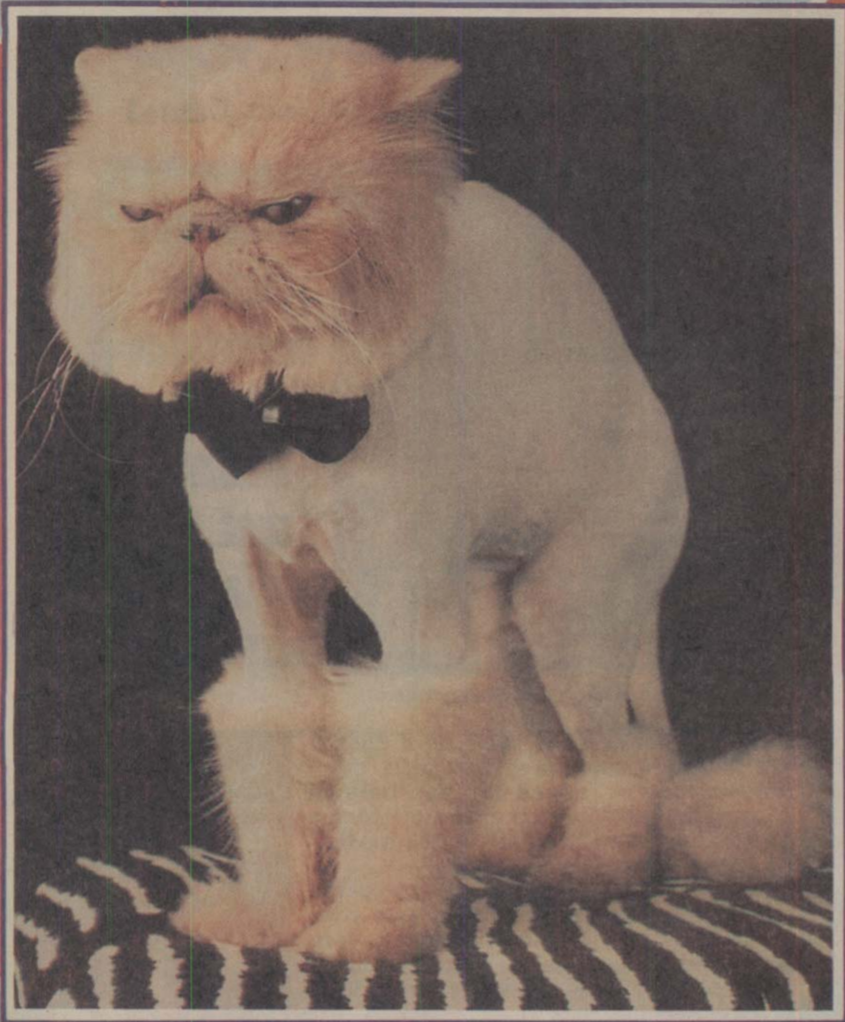

کہتے ہیں کہ درزی یا نائی کی قینچی غلط چل جائے تو فیشن جنم لیتا ہے۔ اس تصویر میں ایک ایرانی بلی اپنی "حجامت" بنوانے کے بعد منہ بنائے بیٹھی ہے۔ اس کے ہیئر ڈریسر کا خیال ہے کہ بلی کو اپنے ہیئر اسٹائل پر کوئی اعتراض نہیں۔ اس کی ناراضگی کی اصل وجہ بو ٹائی ہے کیونکہ بلی گلے میں کچھ بھی

بچّوں کیلئے انمول تحفہ

ڈرامے، گیت، مزاحیہ خاکے، خبریں، معلوماتی پروگرام اور بہت بہت کچھ

فن کار : ظل سبحان، نگہت بٹ، قاسم جیبسی، جمشید انصاری، لطیف، حبیب اللہ انجم، شاہد اسماعیل اور بہت سے دوسرے۔
موسیقی : ارشد محمود ، پروڈیوسر: ظفر محمود شیخ ، ھدایات : سلیم مغل، اظہر نیاز !

ویڈیو میگزین
آنکھ مچولی

آج ہی طلب فرمایئے

قیمت: 150 روپے

Aankh Macholi Video Magazine
1 - PIB Colony Karachi

سونا کیسے دریافت ہوا؟

این اے چوہان

غالباً انسان نے سب سے پہلے جو دھات دریافت کی وہ سونا تھی۔ انسان زمانہ ماقبلِ تاریخ ہی سے سونے کو جانتا تھا اور اس کی قدر کرتا تھا۔ اسی طرح سونا دریافت ہوا۔ اگرچہ سونے کو بہت قیمتی اور نایاب تصور کیا جاتا ہے لیکن حقیقتاً یہ دنیا میں وسیع پیمانے پر بکھرا پڑا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے اسے نکالنا اتنا آسان نہیں کہ یہ فائدہ مند ثابت ہوسکے۔

مثال کے طور پر سمندر کے پانی میں سونے کی تھوڑی سی مقدار ہوتی ہے لیکن کسی کو نہیں معلوم کہ اسے پانی سے کیسے الگ کیا جائے۔ سمندر میں اس قدر پانی ہے اس کے مقابلے میں سونا تقریباً دس ہزار ملین ٹن ہو گا۔ سونا دو شکلوں میں پایا جاتا ہے۔ خالص یعنی جس میں کسی دھات کی آمیزش نہیں ہوتی ہے۔ یا پھر دوسری دھاتوں کے ساتھ ملا ہوا۔ خالص سونا عموماً سنگِ مردہ کی رگوں یا آتشی فولاد کے ڈھیر میں پایا جاتا ہے۔ بعض اوقات سونا یا آتشی فولاد پانی سے صاف ہو جاتے ہیں اور خالص سونا باقی رہ جاتا ہے یہ سونے کی قلمیں آہستہ آہستہ وادیوں کی تہہ میں پہنچ کر ریت مٹی میں مل جاتی ہیں۔ اس شکل میں اسے سیلابی سونا کہتے ہیں پہلے پہل آدمی نے سیلابی سونا ہی دریافت کیا تھا۔ آسٹریلیا میں اس قسم کا تقریباً ۷۰ کلو عمدہ سونا

دریافت ہوا۔ سونا اکثر دوسری خام دھاتوں کے ساتھ بھی ملتا ہے۔ چاندی میں بھی سونے کی کچھ مقدار ہوتی ہے۔ تانبا بھی سونے سے مل کر بنتا ہے۔ آج کل بیشتر سونا دیگر دھاتوں کی طرح کانوں سے نکالا جاتا ہے۔ سونے کے ذخیرے تک ایک گہرا سوراخ کیا جاتا ہے جسے "شافٹ" کہتے ہیں۔ یہ ایک میل سے زیادہ گہرا بھی ہو سکتا ہے۔

پھر خام دھات توڑی جاتی ہے۔ کارٹ میں بھر کر شافٹ تک لائی جاتی ہے اور پھر سطح پر پہنچا دی جاتی ہے پھر اسے کچل کر ریت بنا دیا جاتا ہے اور پھر کیمیائی عمل کے ذریعے سونے کو دوسری دھاتوں سے الگ کر لیا جاتا ہے۔ دنیا کے تین بڑے سونا پیدا کرنے والے ممالک جنوبی افریقہ، روس اور امریکہ ہیں۔

تین وجوہ کی بنا پر سونے کی قدر و قیمت ہے۔ اس کی خوبصورتی، فوائد اور نایابی۔ اگر لوہا بھی اتنا ہی نایاب ہوتا تو اسے بھی خزانہ تصور کیا جاتا۔ سونا نرم زرد دھات ہے۔ یہ تقریباً سب سے بھاری کیمیائی عنصر ہے۔ تقریباً دو سو کیوبک سنٹی میٹر کا وزن ۲۴۰ کلو تک ہوتا ہے۔

سونے پر کام کرنا سب سے آسان ہے۔ اس کو کوٹنا اور مختلف شکلیں دینا اتنا آسان ہے کہ تقریباً ایک گرام سونے کو کوٹ کر دو میٹر لمبی شیٹ بنائی جاسکتی ہے۔

دوسری دھاتوں کی طرح سونا ہوا میں ضائع نہیں ہوتا بلکہ اپنی چمک دمک برقرار رکھتا ہے۔ چنانچہ لوگ اس کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ سونا بہت فعال ہے اور صرف چند شورے ڈالنے سے عمل پذیر ہو جاتا ہے۔ سونے کا عام استعمال رقم کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ اگرچہ سونے کے علاوہ دوسری دھاتوں سے بھی سکے بنائے جاتے ہیں لیکن ان کی وہ قدر و قیمت کبھی نہیں ہوتی۔

۱۹۱۴ء تک تمام دنیا کی کرنسی کو سونے سے ناپا جاتا تھا۔ یعنی امریکی ڈالر، فرانسی فرانک اور جرمن مارک سب کی قیمت سونے سے متعین کی جاتی اور کسی بھی وقت اس کرنسی کو سونے سے تبدیل کیا جاسکتا تھا۔ اسے سونے کا معیاری سسٹم کہتے تھے۔

آج کل یہ ختم ہو گیا ہے لیکن سونا اب بھی بین الاقوامی تجارت میں اہمیت رکھتا ہے۔ سونا ریزرو کی حیثیت سے رکھا جاتا ہے جس سے کسی ملک کی بین الاقوامی تجارت مستحکم ہوتی ہے۔ سونے کے بے شمار استعمال ہیں۔ ہر سال تقریباً دس فیصد سونے کے زیورات بنائے جاتے ہیں۔ دانتوں کے کام میں بھی سونا استعمال ہوتا ہے۔ کیونکہ سونا بجلی کا موصل ہے۔ اس لئے بجلی کے مختلف کاموں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

سونے کی نایابی کی وجہ سے اس کی قیمت اونچی رہتی ہے۔ دنیا کی تقریباً نصف سے زیادہ سونے کی کانیں جنوبی افریقہ میں ہیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ سونے کی ذخائر ۱۸۸۶ء میں دریافت ہوئے۔

سوتا جاگتا ابوالحسن

نیر مسعود

چوتھی قسط

خلیفہ ہارون الرشید حسبِ عادت بھیس بدل کر رعایا کا حال معلوم کرنے نکلا۔ ایک پُل پر اس کی ملاقات ابوالحسن سے ہوئی۔ ابوالحسن نے خلیفہ کو نہ پہچانتے ہوئے اپنا مہمان بننے کی دعوت دی اور شرط لگائی کہ رات کا کھانا کھا کر اور رات گزار کر صبح ہی صبح وہ چلا جائے گا۔ خلیفہ کے پوچھنے پر شرط کی وجہ ابوالحسن نے یہ بتائی کہ وہ ماضی میں اپنے دوستوں کی وجہ سے ساری دولت لٹا چکا ہے۔ اس لئے کسی پر بھروسہ نہیں کرتا۔ لیکن اکیلے کھانے کی عادت بھی نہیں ہے، اس لئے ہر رات کسی نہ کسی کو رات بھر کا مہمان بناتا ہے۔ خلیفہ شرط مان کر ابوالحسن کے گھر چلا جاتا ہے۔ کھانے کے دوران باتوں باتوں میں ابوالحسن اپنی اس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ کاش وہ ایک دن کے لئے خلیفہ بن جائے تاکہ ظالموں کو سزا دے سکے۔ خلیفہ کچھ سوچ کر اسے دھوکے سے بے ہوش کر کے اپنے محل لے جاتا ہے۔ اور تمام غلاموں اور کنیزوں کو راز دار بنا کر ابوالحسن کے ساتھ ایک ڈرامہ کھیلتا ہے۔

اگلی صبح ابوالحسن جاگتا ہے تو غلام اور کنیزیں اور بادشاہ کی خواب گاہ دیکھ کر حیران ہوتا ہے۔ مگر غلام کسی نہ کسی طرح اسے یقین دلا دیتے ہیں کہ وہ امیرالمومنین ہے۔ ابوالحسن محل میں مضحکہ خیز حرکتیں کرتا ہے۔ اور دربار سجا کر اپنے دیرینہ دشمن مولوی اور اس کے ساتھیوں کو سزا دینے کا حکم دیتا ہے۔ ایک دن کی بادشاہت کے بعد ابوالحسن کو واپس پرانی زندگی کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے۔

(منظر) ابو الحسن کا مکان

[دوسرے دن صبح مرغوں کی بانگیں سنائی دے رہی ہیں، ابو الحسن اپنے دیوان خانے میں پڑا سو رہا ہے، کہیں قریب ہی سے مرغ کی تیز بانگ سنائی دیتی ہے اور ابو الحسن کچھ بڑبڑا کر کروٹ بدلتا ہے]

ابو الحسن: (آنکھیں بند کئے کئے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں) ...... اوں ...... ہونہہ ...... مر گئے سب کے سب ...... نہ گانا ہے، نہ بجانا ہے ...... نہ کوئی جگانے والا ہے ...... (پکارتا ہے) سلک مروارید! ...... اری مہ تاب !! ...... (بڑبڑاتا ہے) بھری کم بختیں ! ...... (اور زور سے) مسرور! ...... جعفر!!

[ابو الحسن کی ماں گھبرائی ہوئی داخل ہوتی ہے]

ماں: (ابو الحسن کا شانہ ہلا کر) کیا ہے بیٹا؟ یہ کن لوگوں کو پکار رہے ہو!؟

ابو الحسن: (چونک کر ماں کو گھورنے لگتا ہے) تم کون ہو بڑی بی؟

ماں: (حیرت سے) اوئی بیٹا؟ اپنی ماں کو نہیں پہچانتے؟؟

ابو الحسن: (تیوریاں چڑھا کر) کیا بکتی ہے بڑھیا؟ ہم امیر المومنین ہیں! زبان سنبھال کر بات کر!

ماں: ابو الحسن تو پاگل تو نہیں ہو گیا ہے؟ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے؟؟

ابو الحسن: پاگل تُو خود ہوگی اور مجھے نہیں جانتی تو اب جان لے کہ میں خلیفہ، امیر المومنین، تمام مسلمانوں کی جان و مال کا مالک ہوں!

ماں: (آنکھیں پھاڑ کر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاتی ہے) یاالٰہی! خیر ہو! کیا میرے بیٹے کے اندر کوئی جن سما گیا ہے؟ (ابو الحسن سے بہت پیار کے ساتھ) میرے لال! یہ تجھے کیا ہو گیا ہے؟ دیکھ نا، یہ میں تیری ماں، اور یہ تیرا گھر ہے جہاں تو چھوٹا سا گھُٹنیوں گھُٹنیوں پھرا کرتا تھا! یہیں تُو، پلا بڑھا، جوان ہوا۔ تو میرا بیٹا ابو الحسن ہے۔ امیر المومنین خلیفہ ہارون رشید کو خدا سلامت رکھے بھلا تیرا ان کا کیا مقابلہ؟

ابو الحسن: (پریشان نظروں سے چاروں طرف دیکھتا ہے) نہیں ...... (آنکھیں بند کر کے سوچ میں پڑ جاتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد آنکھیں کھولتا ہے) ...... ہاں اماں تم ٹھیک کہتی ہو۔ یہ میرا

ہی مکان ہے اور میں ابوالحسن ہوں ...... مگر ...... سمجھ میں نہیں آتا یہ شاہی محل میرے دماغ میں کیونکر سما گیا!

ماں : (خوش ہو کر ابوالحسن کی بلائیں لیتی ہے) اے میں قربان! کچھ نہیں کچھ نہیں، کبھی کبھی آدمی ایسے بھی خواب دیکھنے لگتا ہے۔

ابوالحسن: خواب؟ ہاں ہو سکتا ہے خواب ہی ہو۔ میں نے دیکھا کہ میں خلیفہ ہوں۔ میری خدمت کے لئے کنیزیں ہیں، کوکب الصبح ، سلک مروارید، مہ تاب، اور خواجہ سرا ہیں...... (ہاتھ سے ماتھا رگڑتا ہے) ...... مجھے خود یقین نہیں آتا تھا۔ تب میں نے ایک کنیز سے کہا ذرا میری انگلی میں کاٹ ...... (ایک دم اپنی انگلی ہاتھ سے پکڑ کر چلانے لگتا ہے) ...... نہیں نہیں...... یہ خواب نہیں ہو سکتا، یہ خواب نہیں تھا...... ہٹو، مجھے جانے دو۔ میرے دربار کا وقت ہے۔ (اٹھنے لگتا ہے)

ماں : (ابوالحسن کے دونوں ہاتھ پکڑ کر) بیٹا خدا کے لئے...... ہوش کی باتیں کر! یہ کیا اول فول بک رہا ہے؟؟ کہیں خلیفہ کو خبر ہو جائے اور تیرا بھی وہی حال ہو۔ جو ہمارے محلے کے مُلّا اور اس کے ساتھیوں کا ہوا!

ابوالحسن: (مُلّا کے ذکر پر چوکنا ہو کر) کیوں کیوں؟ انہیں کیا ہوا؟

ماں : اے ہونا کیا تھا! جب ان کی بد معاشیاں حد سے بڑھیں تو کل کوتوال نے خلیفہ کے حکم سے ان کی پیٹھیں ننگی کر کے خوب کوڑے لگوائے۔ پھر ان کے منہ پر کالک پوت کر اونٹ پر الٹا سوار کیا گیا اور سارے شہر میں گھمایا گیا۔ مجھے ڈر ہے خدانخواستہ تیری بھی یہی گت ......

ابوالحسن: (اچھل کر) دیکھا، میں نے کیا کہا تھا، ؟ کیوں بڑھیا! اب بھی تجھے یقین نہیں آیا؟ سن لے کان کھول کر کہ وہ میں ہی تھا جس نے مُلّا کو سزا دینے کا حکم دیا تھا۔ اور تو ہے کہ اتنی دیر سے مجھے معلوم نہیں کیا سکھا پڑھا رہی ہے! ہٹ دور ہو میرے سامنے سے کھوسٹ کہیں کی!

ماں : (رونے لگتی ہے) اللہ یہ میرے بچے کو کیا ہو گیا؟

ابوالحسن: (شاہی لہجے میں) بس اب یہ ٹسوے بہانا بند کر، اور بتا سچ سچ کہ میں تیرا کون ہوں؟

ماں: (آنسو پونچھ کر ابو الحسن کی بلائیں لینے لگتی ہے) تو! تو میرا لال ابو الحسن ہے۔ تجھے میں نے دودھ پلایا ہے، اپنی گود میں کھلایا ہے۔ آج نہ جانے کیوں تو خود کو امیر المومنین کہے جا رہا ہے۔ امیر المومنین تو ہم اپنے خلیفہ ہارون رشید کو کہتے ہیں۔ تو بھلا ایسے بادشاہ کی برابری کیا کر سکتا ہے جو اپنی رعایا کو بے مانگے ہزار ہزار اشرفی بانٹ دیتا ہے؟

ابو الحسن: (اشرفیوں کے ذکر پر پھر چونکتا ہے) اشرفیاں؟ کیسی اشرفیاں؟

ماں: اے ابھی کل جس وقت مُلّا اور اس کے گرگوں پر مار پڑ رہی تھی، کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا میں نے دروازہ جو کھولا تو دیکھتی کیا ہوں کہ ایک حبشی غلام زرق برق کپڑے پہنے کھڑا ہے، پوچھنے لگا "ابو الحسن کی ماں تم ہی ہو؟" میں نے کہا۔ "ہاں" بس یہ سنتے ہی اس نے کمر سے ایک تھیلی کھول کر میری طرف بڑھائی اور کہا۔ "لو بڑی اماں اس میں پوری ایک ہزار اشرفیاں ہیں اور یہ تم پر خلیفہ کی عنایت......"

ابو الحسن: (زور سے ہنستا ہے) ہاہاہا...... کیوں کُٹنی؟ اب بول کیا کہتی ہے؟ (چھاتی ٹھونک کر) وہ اشرفیاں میں نے بھجوائی تھیں، میں نے! بس اب جانے دے مجھے، ورنہ کھال کھینچ کر بھس بھروا دوں گا (اٹھ کر چلنے لگتا ہے)

[ابو الحسن کی ماں دونوں ہاتھوں سے اس کی کمر پکڑ لیتی ہے۔ ابو الحسن غصے میں آگ بگولا ہو کر پاس ہی پڑی ہوئی ایک لاٹھی اٹھا کر ماں کو پیٹنا شروع کر دیتا ہے]

ماں: (بدحواس ہو کر چیختی ہے) ہائے مری......! لوگو دوڑو......! مجھے مارے ڈالتا ہے...... ارے کیا تجھے اسی دن کے لئے پالا تھا؟...... بچاؤ بچاؤ......

[تین پڑوسی دوڑتے ہوئے اندر آتے ہیں۔ ابو الحسن کے ہاتھ سے لاٹھی چھین کر پھینک دیتے ہیں اور ماں کو اس سے چھڑاتے ہیں]

پہلا پڑوسی: ہائیں ابو الحسن؟ تجھے اپنی ماں پر ہاتھ اٹھاتے شرم نہیں آئی؟

ابو الحسن: (جھنجلا کر) میں نہیں جانتا ابو الحسن کس گدھے کا نام ہے اور اس کی ماں کون ہے؟

دوسرا پڑوسی: کمال ہے یارو! ارے برخوردار۔ یہ تیرا گھر نہیں تو اور کس کا ہے؟؟ اور یہ بوڑھی خاتون تیری نہیں تو کیا ہماری ماں ہے؟ مذاق کی بھی ایک حد ہوتی ہے یارو!

ابو الحسن: نہیں نہیں۔ بکواس مت کر گستاخ آدمی! یہ ڈائن میری کچھ نہیں لگتی۔ نہ یہ میرا گھر ہے۔ سن رکھو کہ میں امیر المومنین ہوں۔ تم سب کا بادشاہ......

ماں: (سینے پر دو ہتڑ مارتی ہے) ہائے اللہ! بس جب سے یہی رٹ لگی ہوئی ہے کہ میں "امیر المومنین ہوں" مجھ نصیبوں جلی کا ایک ہی تو بیٹا ہے، وہ بھی یوں ہاتھ سے بے ہاتھ ہوا جاتا ہے۔ (پھر رونے لگتی ہے)

تیسرا پڑوسی: میں تو سمجھتا ہوں یہ پاگل ہو گیا ہے۔

ابو الحسن: کیا! تیری یہ ہمت کے مجھے پاگل کہے! کھڑا تو رہ (بڑھ کر لاٹھی اٹھالیتا ہے۔ تینوں پڑوسی ڈر کے مارے پیچھے ہٹ جاتے ہیں)

دوسرا پڑوسی: پاگل؟ ارے باپ...... بچاؤ! داروغہ صاحب! داروغہ صاحب! (پکارتا ہوا دروازے سے گردن باہر نکالتا ہے) داروغہ صاحب! جلدی آئیے...... پاگل ہے! خدا کے لئے......

[باہر سے تیز تیز قدموں کی آواز آتی ہے اور پولیس کا داروغہ اندر داخل ہوتا ہے]

داروغہ: (بھاری آواز میں) یہ سب کیا بلوا مچا رکھا ہے؟

پہلا پڑوسی: داروغہ صاحب! ذرا اس جوان کو دیکھئے! بیٹھے بٹھائے اپنے آپ کو امیر المومنین کہنے لگا!

دوسرا پڑوسی: اور جس ماں نے پالا پوسا، اسی کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا! ذرا ان امیر المومنین صاحب کا انصاف تو دیکھو یارو!

تیسرا پڑوسی: کچھ نہیں صاحب یہ پاگل ہو گیا ہے۔ اور اگر اس کو جلدی ہی بند نہ کیا گیا تو محلے والوں کے لئے سخت خطرہ ہے۔

دوسرا پڑوسی: لے بھلا جس نے اپنی ماں کو نہ چھوڑا وہ ہمیں کیوں بخشنے لگا یارو!

داروغہ: (ابو الحسن سے) کیوں بے! ابھی کل مُلّاجی کا حشر دیکھ چکا ہے، اس کے بعد بھی حواس ٹھکانے نہیں لگے؟

ابو الحسن: (دانت پیس کر) نمک حرام! تیری یہ مجال کے اپنے خلیفہ سے ابے تبے کرے! داروغہ کی دُم کہیں کا! ٹھہر تو سہی......!

[لاٹھی سے داروغہ کی کمر پر دو تین ہاتھ جھاڑ دیتا ہے۔ داروغہ بوکھلا کر پڑوسیوں پر اور پڑوسی ایک دوسرے پر گرتے ہیں۔ آخر داروغہ سنبھل کر پڑوسیوں کو للکارتا ہے]

داروغہ: لینا اسے! (تینوں پڑوسی ابو الحسن کو مضبوطی سے پکڑ لیتے ہیں) ہاں! یہ بات ہے۔ تو پھر یا

امیر المومنین اب آپ کا یہ غلام آپ کی خدمت کے لئے تیار ہے ...... بسم اللہ!

[ابو الحسن کے آگے ادب سے جھکتا ہے۔ پھر کوڑا نکال کر اس زور سے مارتا ہے کہ ابو الحسن بلبلانے لگتا ہے۔ اس کی ماں پھر رونے لگتی ہے]

ماں: خدا کے لئے اسے نہ مارو۔ یہ پاگل نہیں ہوا ہے۔ اس کو شیطان نے بہکا دیا ہے۔ پرسوں رات وہ اس کے پاس موصل کے سوداگر کے بھیس میں آیا تھا۔

ابو الحسن: اپنی چونچ بند رکھ بڑھیا! آج ہم دربار میں اس داروغہ کو ایسی سزا دیں گے کہ لوگ مُلّا کی درگت کو بھول جائیں۔

داروغہ: (بھنویں چڑھا کر) آج چھا!! (جیب سے ہتھکڑیاں نکالتا ہے) مگر اس سے پہلے میرا یہ نذرانہ قبول فرمائیے! (ابو الحسن کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیتا ہے) اور اب اپنے دربار کی طرف تشریف لے چلئے جہاں لوہے کی سلاخوں والا تخت آپ کا انتظار کر رہا ہے!

[ابو الحسن کو لے کر دروازے کی طرف چلتا ہے۔ پڑوسی بھی پیچھے ہو لیتے ہیں]

ماں: (ان لوگوں کی طرف بڑھتی ہے) کہاں لئے جا رہے ہو میرے بچے کو! چھوڑ دو خدا کے واسطے۔ اس پر کسی جن کا سایہ ہو گیا ہے۔ ہائے نہیں سنتے کم بختو! او موصل کے سوداگر! اللہ تجھ سے سمجھے......

[سب لوگ باہر چلے جاتے ہیں]

(قید خانے میں ابو الحسن پر کیا گزری۔ آئندہ شمارے میں پڑھئے)

آنکھ مچولی کا تحفہ

مارچ ۱۹۹۵ء میں ہونے والے قرعہ اندازی میں "آنکھ مچولی کا تحفہ" حاصل کرنے والے ساتھیوں کے نام:

(۱) عبد الصمد خان، دیر (۲) ساجد شریف، حافظ آباد (۳) صدف خلیل، کراچی (۴) زاہد اقبال، بہاولنگر (۵) بشریٰ احسان، سرگودھا (۶) محمد حسین بلوچ، بہاولنگر (۷) نوین گل، پشاور (۸) سائرہ الماس خانیوال (۹) محمد شاہد سعید احمد، حیدر آباد (۱۰) سرفراز علی، قصور۔

ہنستے ہنستے

منتخب لطائف

*

آصف: شاہد سے مخاطب ہو کر بولا "شاہد ذرا مار کر دکھانا" شاہد اٹھا اور زور سے تھپڑ مارا۔

آصف چیخا اور بولا "یہ کیا کیا؟" شاہد، "ابھی آپ ہی تو بول رہے تھے کہ مار کر دکھانا" "میں اس مارکر کی بات کر رہا ہوں جو آپ کی جیب میں ہے۔" آصف نے کہا۔

مرسلہ : عمران رؤف، حیدر آباد

--- ☆ --- ☆ ---

ایک شخص ہوٹل میں پہنچ کر رہائشی کمروں کے رجسٹر پر اپنا نام اور پتا لکھ رہا تھا۔ اتفاق سے ایک مچھر وہاں آکر بیٹھ گیا جہاں اس نے اپنے کمرے کا نمبر لکھا تھا۔ یہ دیکھ کر اس شخص نے کہا، "صاحب میں نے کئی ہوٹلوں میں قیام کیا اور ہر ہوٹل میں مچھر دیکھے ہیں لیکن اس ہوٹل کے مچھر تو بڑے ہوشیار ہیں وہ خود آکر رجسٹر میں دیکھ لیتے ہیں کہ کونسا مسافر کس کمرے میں ٹھہرا ہے۔"

مرسلہ : عالیہ شارق، کراچی

--- ☆ --- ☆ ---

باپ نے بیٹے سے کہا "اگر تم میرے تیرنے تک کنارے پر ایک ہی جگہ بیٹھے رہو تو میں واپس

آکر ایک روپیہ انعام دوں گا"
بیٹے نے کہا "اگر آپ واپس نہ آئے تو کیا میں ممی سے لے لوں؟"

مرسلہ : زمرہ وسیم، کراچی

--- ☆ --- ☆ ---

ایک لڑکے نے دھوبی سے پوچھا "پتلون پر پریس کرنے کا کیا لوگے؟"
دھوبی نے کہا "آٹھ آنے"
لڑکے نے کہا "صرف ایک پائنچے پر پریس کر دو میں سائیڈ پوز دیکر فوٹو کھنچوالوں گا۔"

مرسلہ : نمرہ وسیم، کراچی

--- ☆ --- ☆ ---

"توبہ توبہ" سیاح نے کان پکڑتے ہوئے کہا "وہاں اتنی ٹھنڈ تھی کہ موم بتی کا شعلہ منجمد ہو کر رہ جاتا تھا۔ اور ہم اسے پھونک مار کر بجھا نہیں سکتے تھے۔"
"یہ تو کچھ بھی نہیں" سننے والوں میں سے ایک بولا "جہاں ہم رہتے تھے وہاں سردی کا یہ عالم تھا کہ الفاظ بھی ہمارے منہ سے ڈلیوں کی طرح نکلتے تھے اور ہم انھیں چمچ میں ڈال کر گرم کر کے ان پر کان دھرتے تھے کہ کہنے والے نے کیا کہا ہے۔"

مرسلہ : حاجی مظہر حسین لاشاری، بھاولنگر

--- ☆ --- ☆ ---

ایک ساس اپنی بہو کو ہر وقت منحوس کہا کرتی تھی۔ جب بہو کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی تو ساس بڑی خوش ہوئی۔ بہو نے پوچھا! "لڑکی پیدا ہونے پر اتنی خوشی کیسی؟"
ساس نے جواب دیا "اگر لڑکا پیدا ہوتا تو ایک اور منحوس گھر میں آجاتی۔"

مرسلہ : محمد شاہ زیب اسلم، کراچی

--- ☆ --- ☆ ---

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ڈاکٹروں کی ہینڈ رائٹنگ کتنی خوبصورت ہوتی ہے۔
ایک دفعہ ایک ڈاکٹر کو اپنے بچوں کے لئے ٹیوٹر کی ضرورت تھی تو اس نے اشتہار لکھا۔ "ضرورت ہے بچوں کی پڑھائی کے لئے ٹیوٹر کی" جب اشتہار چھپا تو لکھا تھا۔ "ضرورت ہے بچوں کی پٹائی کے لئے ایک ہنٹر کی۔"

مرسلہ : شیر نواز گل، ارمڑ پایان

--- ☆ --- ☆ ---

ایک دفعہ ایک شخص نے سرسید سے پوچھا'
اگر نماز میں بجائے عربی عبارتوں کے ان کا اردو ترجمہ پڑھ لیا جائے تو کوئی حرج یا نقصان تو نہیں ہو گا ؟

سرسید نے جواب دیا "ہرگز کوئی حرج یا نقصان نہیں 'بس اتنی بات ہے کہ نماز نہیں ہوگی"۔

مرسلہ : محمد بلال' سوات

--- ☆ --- ☆ ---

ایک صاحب نے اپنے دوست سے کہا "میرا بال بال قرضے میں جکڑا ہوا ہے۔ میں کیا کروں؟"

"سر منڈوا دو" دوست نے جواب دیا۔

مرسلہ : جاوید اختر' سوات

--- ☆ --- ☆ ---

ڈاکٹر (اپنے دوست سے) "میری دوا پانچ منٹ میں اثر کرتی ہے۔"

دوست : "بالکل ٹھیک' اسی لئے تو کسی عقلمند نے تمہارے کلینک کے سامنے کفن کی دکان کھول لی ہے۔"

مرسلہ : جنید اختر' کراچی

--- ☆ --- ☆ ---

بیٹا (اپنے باپ سے) ابو آپ تو مجھ سے بالکل محبت نہیں کرتے۔ جب کہ یہ پڑوس والے انکل اپنے بیٹے کو چاند اور تارا کہہ کر پکارتے ہیں۔

باپ : بات یہ ہے بیٹے کہ وہ ماہرِ فلکیات ہیں اور میں جانوروں کا ڈاکٹر ہوں۔

مرسلہ : عاصم الدین' بہاولپور

--- ☆ --- ☆ ---

بیٹا : "ماں! ہم مہمان کے آگے تین روٹیاں کیوں رکھتے ہیں؟ جب کہ وہ کھاتا تو دو ہے۔"

ماں : "تیسری روٹی ہماری عزت ہوتی ہے۔"

ایک دن ایک مہمان آیا' اس کے آگے تین روٹیاں رکھیں۔ دو روٹیاں کھا کر جب وہ تیسری روٹی کھانے لگا تو بیٹا بھاگا بھاگا ماں کے پاس آیا اور معصومانہ انداز میں کہا'

"ماں! ماں! مہمان ہماری عزت کھا رہا ہے۔"

مرسلہ : اسما بتول' کراچی

--- ☆ --- ☆ ---

استاد : ٹیل (Tail) کے معنی دُم تم نے ٹھیک بتائے ہیں۔ اب یہ بتاؤ' ٹیلر ماسٹر کے کیا معنی ہیں؟

شاگرد : دُم والا ماسٹر۔

مرسلہ : عائشہ سمیہ' کراچی

--- ☆ --- ☆ ---

مصنف : (نئے ملازم سے) یہ کون سا کاغذ جلا رہے ہو؟"

ملازم :" وہی جو آپ نے ابھی ابھی لکھے ہیں۔ میں کوئی پاگل تو نہیں جو بغیر دیکھے سادہ کاغذ جلا دوں۔"

مرسلہ : محمد بلال' خانیوال

--- ☆ --- ☆ ---

مالک نے نوکر کو ایک خط دے کر کہا۔" خط پر ایک روپے کا ٹکٹ لگا کر لیٹر بکس میں ڈال دے۔"

نوکر ذرا بے وقوف تھا۔ وہ لیٹر بکس میں خط ڈال آیا۔ مالک نے پوچھا" "کیوں بھئی! خط پر ٹکٹ لگا دیئے تھے نا۔" نوکر نے خوشی خوشی جواب دیا۔

""نہیں جناب میں نے آپ کے پیسے بچا لئے۔ ڈاکیئے کی نظر بچا کر بغیر ٹکٹ لگائے ہی خط لیٹر بکس میں ڈال دیا۔"

مرسلہ : محمد عظیم قریشی' اسلام آباد

--- ☆ --- ☆ ---

ایک ماہر نفسیات کے کلینک میں دو مریض باتیں کر رہے تھے۔ ایک مریض بولا' "تمہیں پتہ ہے کراچی میں ہر تین منٹ بعد ایک راہگیر کو ٹکر مار دی جاتی ہے" دوسرا بولا "تو اس راہگیر کی حالت اب تو بہت بری ہو گی۔"

مرسلہ : احسن خورشید' کوئٹہ

--- ☆ --- ☆ ---

بیوی شاپنگ کر کے گھر آئی اور شوہر سے بولی "دیکھئے میں آپ کے لئے کتنا اچھا رومال لائی ہوں" شوہر نے حیرت سے کپڑے کو دیکھا اور بولا "اتنا بڑا رومال یہ تو کوئی چھ گز کا ہو گا۔" بیوی بولی "آپ کے رومال سے جو کپڑا بچے گا اس کا میں سوٹ سلوا لوں گی۔"

مرسلہ : سحرش الطاف' کراچی

--- ☆ --- ☆ ---

آیا آیا بہار کا موسم

حفیظ الرحمٰن احسن

آنے والے بہار کے دن تھے — شوق کے — انتظار کے دن تھے
کوئی کونپل کہیں، نہ سبزہ تھا — باغ سارا اداس لگتا تھا
شاخ کو گدگدی ہوئی اک روز — سرخوشی اس پہ چھا گئی اک روز
اس کا سویا نصیب جاگ اٹھا — اس کے پہلو میں کھل اٹھا غنچا
کان میں اس کے، کچھ صبا نے کہا — سن کے بات اس کی جھوم جھوم اٹھا
ہنس دیا غنچہ — پھول کھلایا — باغ کا باغ اس نے مہکایا!
تتلیوں نے بھی رنگ بکھرائے — اپنے پرچم فضا میں لہرائے
پھول ہی پھول کھل اٹھے ہر سو — ہر طرف پھیلتی گئی خوشبو
آ چکا تھا بہار کا موسم — سرخوشی کا — نکھار کا موسم
گیت گانے لگے سبھی باہم
آیا، آیا بہار کا موسم!

بنام آنکھ مچولی

قارئین کے منتخب خطوں کے جواب

فاطمہ تراب علی، ہالائی۔ فروری کے شمارے میں "پیارے ابا جان آپ روزہ کیوں نہیں رکھتے" بہت پسند آئی۔ قلم دوست میں حرا سجاد کا انٹرویو اچھا تھا۔ **شیخ علی رضا، پتوکی۔** سرورق بہت خوبصورت تھا۔ "قصہ ایک ناک کا" "اداکار بھوت" "چور پکڑا گیا" اور قسط وار کہانی بہت پسند آئی۔ **رانا فیض علی، صادق آباد۔** عاقب جاوید سے مل کر دل باغ باغ ہوگیا۔ کہانیاں بھی پسند آئیں۔ **محمد زاہد سلیم، کراچی۔** "اردو کا سب سے بڑا شاعر" "قسط وار کہانی" عبدالقادر صاحب کی نظم اور "سوتا جاگتا ابوالحسن" جیسی کاوشیں بہت پسند آئیں۔ قلم دوست میں حرا سجاد کا انٹرویو اور "اس طرح تو ہوتا ہے" کا دوسرا ٹکڑا اچھا لگا۔ **حفیظ ضیا، رحیم یار خان۔** فروری کا شمارہ اپنی مثال آپ تھا۔ اگر آپ میرا خط شائع نہیں کرنا چاہتے تو جوابی خط کے ذریعہ بتادیں۔ ○ ---- بھائی حفیظ! یہاں خطوط کی ایک لائن لگی ہوتی ہے جو خطوط پہلے موصول ہوتے ہیں وہ پہلے شامل کیے جاتے ہیں اور پھر دوسرے خطوط کی باری آتی ہے۔ **ساجد علی عباسی، نواب شاہ۔** آنکھ مچولی مجھے اچھا لگتا ہے میں اسے ایک سال سے پڑھ رہا ہوں۔ اور اس میں پہلی بار شریک ہو رہا ہوں۔ ○ --- خوش آمدید! **عالم شفیع ہمدم، جھنگ۔** سرورق خوب تھا۔ ہر تحریر اپنے اندر منفرد پہلو لئے ہوئے تھی۔ **عفیفہ اطہر، گدو۔** "مجھے میرے چچا جان سے بچاؤ" کے

مصنف پکڑے گئے انہوں نے اپنی کہانی میں بعض فقرے مشہور ادیبوں کے لگائے ہیں۔ **شیر نواز گل' ارمڑ پایان۔** میں آپ سے بہت خفا ہوں آپ میری تحریریں شائع نہیں کرتے!! ○ -----۔ آپ نے آج تک کوئی بھی تحریر ہماری پسند کی نہیں بھیجی۔ آخر ردی کی ٹوکری والی تحریریں کب تک بھیجتے رہیں گے۔ دلچسپ اور معیاری تحریریں ارسال کیجئے۔ **عبدالقدوس' والبندین۔** آنکھ مچولی پڑھا۔ تمام کہانیاں بے حد مزیدار تھیں۔ **جواہر لال' کندھ کوٹ۔** فروری کا شمارہ کچھ دیر سے ملا سب کہانیاں پسند آئیں لیکن لطیفے کچھ بور لگے۔ سائنسی معلومات بھی کم تھیں۔ **عشرت' جمشید' کراچی۔** آپ کو "پیارے" کہنے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا ہے۔ آپ بہت "وہ" ہیں۔ آپ نے کھلاڑیوں سے ہمارے سوالات ......؟ ○ -----۔ پیارے ساتھیو! جو سوالات کھلاڑیوں کو ناگوار گزرتے ہیں وہ ہم ان تک نہیں پہنچاتے یا پھر ان کا انداز تبدیل کردیا جاتا ہے۔۔۔ اتنی سی بات پر بس آپ ناراض ہوگئے!! **محمد ظفر اللہ ضیا' کمالیہ۔** میرے ایک دوست فیصل عمران ڈوگر کا انعامی مقابلے میں جیولری بکس نکلا تھا مگر یہ انعام ان تک نہیں پہنچا حالانکہ کئی خطوط لکھ کر وہ آپ کو یاد دھانی کروا چکے ہیں۔ ○ -----۔ برادر! ان کا انعام انہیں بھیجا گیا تھا۔ نہیں ملا تو یہ ڈاک والوں کی گڑبڑ ہے ہم نے انہیں لکھا تھا کہ وہ اپنے ڈاک خانے کے پوسٹ ماسٹر جنرل سے رابطہ کریں! **حسیب احمد' جہلم۔** فروری کے شمارے میں چھپنے والی تحریر "مجھے میرے چچا جان سے بچاؤ" پطرس بخاری کے مضمون "ہاسٹل" سے اخذ کی گئی ہے۔ **کاشف الرحمان صابر' ڈیرہ اسماعیل خان۔** آنکھ مچولی کی کہانیاں عمدہ اور اچھی ہوتی ہیں۔ فروری کا سرورق خاص نہیں تھا۔ مجلس ادارت کے منیر احمد راشد کو پوزیشن حاصل کرنے پر مبارک باد۔ ○ ----۔ منیر احمد راشد کی طرف سے شکریہ۔ **محمد شاہد اعجاز' نیو مظفر آباد۔** فروری کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ "سنہرے حروف" "حمد باری تعالیٰ" اور "روزہ رکھنے کے فائدے" اچھی تحریریں تھیں۔ **مریم ارشاد' لاہور۔** میری خواہش ہے کہ آپ اب شرارت نمبر نکالیں۔ ○ -----۔ آپ کی یہ شرارت ہم فروری ۹۴ء میں پوری کر چکے ہیں۔ **محمد عظیم قریشی' اسلام آباد۔** قلم دوست میں "ہاں یہ میرا بیٹا ہے" "رب کے کام" اور نظم "پکے ہو نہ کچے ہو" بہترین کاوشیں تھیں۔ نیو کلئیر انرجی پر مضمون بے حد معلوماتی تھا۔ **فیصل شہزاد' مان نوالہ۔** نظم "پیارے ابا جان" "سوتا جاگتا ابوالحسن" "واپسی اپنوں میں" اور قلم دوست کی تحریریں اچھی تھیں۔ آپ کراچی والوں کی تحریریں زیادہ شائع کرتے ہیں۔ ○ -----۔ تحریریں چاہے کراچی والوں کی ہوں یا کندھ کوٹ والوں کی' رسالے کے معیار پر پوری اتریں تو ہی جگہ پائیں گی۔ **محمد رحمت اللہ بشیر' گجرات۔** میرے دوست تنویر احمد گجراتی کی زبردست خواہش ہے کہ ان کا نام آنکھ مچولی میں چھپ جائے۔ ○ -----۔ بھئی اس طرح نام چھپوانے سے بہتر ہے کہ وہ کوئی اچھی سی تحریر لکھیں یا کوئی اچھا سا کام کریں تاکہ ان کا نام روشن ہو۔ **ذیشان شریف' لاہور۔** آنکھ مچولی کا آٹھ سال پرانا قاری ہوں یہ رسالہ مجھے شروع ہی سے پسند ہے۔ **عامر خالق' عامرہ خالق' ایبٹ آباد۔** قلم دوست کی تمام تحریریں بہت

اچھی تھیں۔ نیا سلسلہ "اب میں کیا کروں" پسند آیا۔ آنکھ مچولی کے سابق مدیر منتظم جناب محمود فاروقی کے والد صاحب کے انتقال پر بہت رنج ہوا۔ اللہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے! **عبدالمتین قوی، پسنی۔** شمارہ بہت ہی اچھا تھا کہانیاں سب ہی اچھی لگیں سرورق بھی خوبصورت تھا۔ **گہرام حیات، تربت۔** مزید محنت کی ضرورت میں آپ نے میرا نام غلط شائع کر دیا۔ ○ ۔۔۔۔۔ اس غلطی پر ادارہ معذرت خواہ ہے۔ **سحر شیخ، نوابشاہ۔** سرورق خوبصورت تھا۔ کہانیوں میں "وہ کیا راز تھا" بہت اچھی لگی۔ **وجیہہ انوار، کراچی۔** میرے پیارے بھائی ۱۹ر نومبر کو ہنگاموں میں گولی لگنے سے انتقال کر گئے۔ وہ آنکھ مچولی بہت شوق سے پڑھتے تھے۔ ○ ۔۔۔۔ ادارہ آپ کے دکھ میں برابر کا شریک ہے۔ اللہ تعالٰی سے دعا ہے کہ آپ کے پیارے بھائی جان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے آمین! **نوشین شیخ، نوابشاہ۔** "وہ کیا راز تھا" نمبرون کہانی ہے اس کی کتنی قسطیں ابھی باقی ہیں؟ ○ ۔۔۔۔۔۔ اس شمارے میں اس کی آخری قسط ہے۔ **ماریہ بانو، کراچی۔** جنوری کا شمارہ پسند آیا کہانی "مس تو میں ہوں" میں ایک جگہ لکھا تھا شنی نے کہا۔ (میں آٹھویں جماعت میں پڑھتی ہوں) اس پر فیصل نے نقل اتارتے ہوئے کہا (نویں جماعت کی طالبہ ہو) **عدنان احمد، کراچی۔** فروری کا شمارہ فروٹ چاٹ کا مزہ دے گیا۔ "قصہ ایک ناک کا" "واپسی اپنوں میں" اچھی تحریریں تھیں جبکہ قسط وار کہانی نے اپنی اہمیت برقرار رکھی۔ نظموں میں "کبھی اپنے ماموں کراچی جو آئیں" زبردست تھی۔ **شہروز علی، گوجرانوالہ۔** شرجیل نذر نے اپنی کہانی پطرس بخاری کے مضمون سے اخذ کی ہے تقریباً سب کچھ وہی ہے۔ بس انہوں نے اسے مختصر کر لیا ہے۔ **اسماء الحسنیٰ یونس، کراچی۔** شمارہ ہر لحاظ سے اچھا تھا۔ کہانیوں میں "وہ کیا راز تھا" "واپسی اپنوں ہی میں" اور "قصہ ایک ناک کا" بے حد اچھی لگیں۔ **اکرم، صادق آباد۔** سرورق بہت اچھا تھا۔ کہانیاں بھی پسند آئیں۔ **محمد آصف جاوید خان، ڈیرہ غازی خان۔** پچھلے دو سال سے خط لکھ رہا ہوں مگر کوئی نہیں چھپا۔ ○ ۔۔۔۔ برادر! آپ کے خطوط اکثر و بیشتر چھپتے رہتے ہیں۔ **محمد نوید پھول والا، کراچی۔** اس ماہ کا رسالہ دیر سے ملا۔ "اداکار بھوت" بہترین کہانی تھی۔ "سوتا جاگتا ابوالحسن" اچھا جا رہا ہے۔ "واپسی اپنوں ہی میں" اور "وہ کیا راز تھا" بالکل پسند نہ آئیں۔ **تہمینہ حنیف، شیخوپورہ۔** نظمیں اور کہانیاں پسند آئیں۔ رسالہ بہت دبلا پتلا ہو گیا ہے کیا اس وجہ سے تو نہیں کہ کاغذ کی قیمت بڑھ گئی ہے۔ **سیما عقیل الرحمٰن راجپوت، حیدر آباد۔** آپ بنام آنکھ مچولی میں بور اور فضول سوالات شائع کرتے ہیں۔ ایسے خطوط شائع کیجئے جو واقعی دلچسپ ہوں۔ **بالاچ بلوچ، پسنی۔** نیا سلسلہ "اب میں کیا کروں" بہت اچھا سلسلہ ہے۔ قلم دوست میں زیادہ تحریریں شائع کریں یہ ایک دلچسپ اور معلوماتی حصہ ہے۔ **ناصر حفیظ، ملتان۔** اچھی کہانیوں پر ایوارڈ کا سلسلہ شروع کریں ان سے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ ○ ۔۔۔۔۔ آپ کی تجویز نوٹ کر لی گئی ہے۔ **فیصل احمد خان، کراچی۔** ظفر محمود صاحب نے اداریہ لکھنا کیوں چھوڑ دیا کیا وہ اتنے مصروف ہو گئے ہیں کہ ایک "اداریہ" بھی نہیں لکھ سکتے؟ **مبشر**

عباس، شیخوپورہ۔ فروری کا شمارہ بہترین تھا۔ شرجیل نذر کی کہانی "مجھے میرے چچا جان سے بچاؤ" فرسٹ ایئر کی اردو کی کتاب کے ایک مضمون سے ملتی جلتی ہے۔ ○ ۔۔۔۔۔جی ہاں آپ کا کہنا درست ہے۔ پطرس بخاری کے مضمون سے متاثر ہو کر یہ تحریر لکھی گئی ہے۔ آپ لوگوں کے توجہ دلانے پر ہمیں بھی یہی احساس ہوا۔

عدنان عادل، حیدر آباد۔ مارچ کا سرورق بہت خوبصورت تھا اور عید کارڈ۔۔۔۔۔ کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔۔۔ دل خوش کردیا آپ نے! **محمد بلال تاج، کراچی۔** تازہ شمارے میں "جیت" "بے چارے" "تم نہیں آؤ" سب سے اچھی لگیں۔ نظموں میں "ایٹم" اور "انبی کا روپیہ" پسند آئیں۔ **محمد عمر تاج، کراچی۔** سلسلے وار کہانی "وہ کیا راز تھا؟" اچھی جارہی ہے۔ خاص نمبر کا بے چینی سے انتظار ہے۔ **سید کاشان علی، کراچی۔** "کولمبس اور انڈا" "تم نہیں آؤ" "گھڑی نے ایک بجایا" اور "سب سے بڑے قومی رہنما" اچھی کاوشیں تھیں۔ **روح اللہ سعدی، کراچی۔** "اسلام جیتا مسلمان ہارا" "جیت" اور قلعہ سر ہوگیا" "ایک کپ چینی" اور "کرکٹ کرکٹ" نے بہت متاثر کیا۔ "سوتا جاگتا ابوالحسن" اور "وہ کیا راز تھا؟" بہت دلچسپ سلسلے جارہے ہیں۔ "بے چارے" کچھ عجیب سی محسوس ہوئی۔ **نائلہ صدیقی، کراچی۔** سرورق خوش رنگ تھا اس دفعہ کہانیاں مضامین کے لحاظ سے کم تھیں۔ مضامین بھی معلوماتی اور سنجیدگی کے حامل تھے۔ معلومات اور سنجیدگی ہرگز کوئی بری شے نہیں لیکن اس کے ساتھ دلچسپ ہلکی پھلکی چیزوں خصوصاً کہانیوں کی تعداد و تناسب کا لحاظ رکھا جائے تو پڑھنے والوں کی دلچسپی میں اضافہ ہوجاتا ہے کیونکہ بچوں کی بنیادی دلچسپی کہانیوں میں ہی ہوتی ہے۔ کہانیوں میں "بے چارے" "جیت" "وہ کیا راز تھا؟" اچھی تھیں۔ سلسلہ وار ڈرامہ اور عبدالقادر صاحب کی نظم لطف دے گئی۔ عبدالقادر صاحب مضمون اور الفاظ دونوں کے انتخاب میں کمال رکھتے ہیں۔ لطائف کے سلسلے میں ذرا چھان پھٹک کی ضرورت ہے نئے لطیفے تلاش کیجئے کچھ نہیں تو وزیروں کے بیانات ہی شائع کردیا کیجئے۔ آمنے سامنے کا سلسلہ اچھا ہے لیکن اب اس میں عبدالقادر صاحب، منیر احمد راشد ، عمر احمد خان اور دیگر لکھاریوں سے براہ راست سوال و جواب کا موقع دیں۔ ○ ۔۔۔۔ اتنا جامع اور مفصل تبصرہ کا بے حد شکریہ! آپ کی تجویز نوٹ کرلی گئی ہے۔ **محمد حسین عارف، کراچی۔** مارچ کا شمارہ پسند آیا۔ اسلامی مضمون "اسلام جیتا مسلمان ہارا" نہایت اچھا لگا۔ **عرفان محمد حسین واگڑیا، کراچی۔** مارچ کا سرورق اگر عید کی مناسبت سے ہوتا تو بہتر ہوتا۔ کہانیوں میں عادل منہاج کی کہانی بہت پسند آئی۔ **صبا فیاض، ملتان کینٹ۔** اس دفعہ رسالے کی تمام کہانیاں پسند آئیں۔ لطائف شاندار تھے مضامین اور نظموں کا تو جواب نہیں۔ میں کوئی مکھن نہیں لگا رہی کیوں کہ مہنگائی کی وجہ سے مکھن پہلے ہی مہنگا ہوگیا ہے۔

اب میں کیا کروں؟

میں اپنے بھائی بہنوں میں سب سے بڑا ہوں اور شاید یہی میرا جرم ہے۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے یہی احساس ہوا ہے کہ میرا چھوٹا بھائی گھر والوں کی آنکھ کا تارا ہے۔ ہر معاملے میں اسی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ابو اور امی مجھے تو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے۔ جب احتجاج کرتا ہوں تو جواب ملتا ہے کہ تم اپنے چھوٹے بھائی سے جلتے ہو، تمہیں اس سے پیار نہیں ہے۔ خدا جانتا ہے کہ ایسا نہیں ہے لیکن انصاف تو ہونا ہی چاہئے۔ وہ امتحان پاس کرتا ہے تو دوستوں کی پارٹی کرتا ہے، اس کے لئے تحفے تحائف آتے ہیں، اس کی ہر جگہ تعریفیں ہوتی ہیں...... اور سارے جہاں کا نکمّا میں ہی ہوں۔ مجھ میں تو جیسے کوئی خوبی ہی نہیں ہے۔ بڑا جو ٹھہرا۔ کراچی میں حالات خراب ہوئے تو اسے پڑھائی کے لئے لاہور بھیجنے کے پروگرام بن رہے ہیں۔ لیکن میری کسی کو فکر نہیں ہے۔ چاہے میرے کتنے ہی سال ضائع ہو جائیں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں اپنے آپ کو ختم کر ڈالوں۔ کیا فائدہ ایسی زندگی سے۔ آنکھ مچولی میں یہ نیا سلسلہ دیکھا تو جی چاہا کہ آپ لوگوں سے پوچھ لوں کہ کیا بڑا بھائی ہونا کوئی جرم ہے، کیا ذمہ داریاں ساری بڑے بھائیوں کے لئے ہوتی ہیں اور سارے انعام و اکرام اور پیار و محبت کے مستحق چھوٹے بھائی ہوتے ہیں.... بتایئے ---- جواب دیجئے؟؟

(ت، ع، کراچی)

گزشتہ ماہ ع الف نے اپنے والدین کے رویئے کی شکایت کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کے والد اور والدہ دونوں ملازمت کرتے ہیں جس کی وجہ سے بچوں پر وہ توجہ نہیں دے پاتے اور یوں بچے والدین کی زندگی میں خود کو یتیم محسوس کرتے ہیں۔ اس مسئلے کے سلسلے میں ہمیں قارئین کی جانب سے بہت سے مشورے موصول ہوئے۔ ان میں سے چند کا خلاصہ یہ ہے۔

سیدہ حنا نورین کاظمی، کراچی - ع الف صاحبہ آپ کہتی ہیں کہ آپ بدنصیب ہیں؟ آپ تو اتنی خوش قسمت ہیں کہ آپ کے ماں باپ، بھائی، بہن بھی ہیں ماشاء اللہ۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ اپنا رویہ ہر حال میں بہتر رکھیں۔ اپنے ابو سے ان کے دفتر کے بارے میں باتیں کیجئے۔ اگر انہیں کوئی مسئلہ درپیش ہے ان کو مشورے دیجئے۔ امی سے ان کے کام اور ان کے آفس کے بارے میں پوچھئے۔ گھریلو کام کاج میں حصہ لیجئے۔ پھر آپ دیکھئے گا کہ آپ کی شکایتیں خود بخود کم ہونے لگیں گی۔

ریاض راہی برڑو، ٹنڈو محمد خان - ع الف کو چاہئے کہ اپنی امی اور ابو کو ساری باتیں بتا دیں۔ لیکن ساتھ ہی انہیں یہ بھی غور کر لینا چاہئے کہ خود ان کا اپنا رویہ کیسا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ ہر وقت کھیل کود میں لگی رہتی ہوں اور اسکول وغیرہ کا کام وقت پر نہ کرتی ہوں۔ رہی بات یتیم کی تو سن لیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یتیم میں اسے کہوں گا جس نے علم نہیں سیکھا۔

بشریٰ شارق، کراچی - میرے خیال میں آپ امی سے گھر پر رہنے کا مطالبہ کریں۔ اگر وہ نہ مانیں تو ان سے تھوڑے دنوں کے لئے ناراض ہو جائیں۔ اگر پھر بھی نہ مانیں تو اللہ تعالیٰ سے دعا کریں اور صبر کریں۔ انشاء اللہ آپ کا مسئلہ جلد حل ہو جائے گا۔

سعدیہ شارق، کراچی۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ اپنی پڑھائی پر توجہ دیں اور کوشش کریں کہ اپنے والدین کی خدمت دل و جان سے کریں۔ ہو سکتا کہ وہ اسی میں خوش ہو جائیں اور آپ سب بھائی بہنوں پر توجہ دیں۔ (آمین)

جن دیگر ساتھیوں کے مشورے پچھلے ماہ موصول ہوئے۔

مختار شاہ، اٹک۔ شیخ علی رضا قمر، پتوکی۔ فراز ارشاد، کراچی۔ رانا فیض علی فیض، صادق آباد۔ شبنم عقیل الرحمٰن راجپوت، سیما عقیل الرحمان راجپوت، حیدر آباد۔ رفعت قریشی، میرپور۔ چنگیز خان، کوئٹہ۔ محمد علی خرم صدیقی، حیدر آباد۔ خرم نذر اشرفی، کراچی۔ حجاب بخاری، راولپنڈی۔

انعامی حل — نادیہ شارق، عزیز آباد، کراچی

اللہ نے انسان کو اس کی فطرت کے مطابق ہی کام سونپے ہیں کہ باہر کی ذمہ داری مردوں کی ہے۔ اور گھر کی ذمہ داری عورتوں کی۔

اب اگر آپ کی امی گھر کے بجائے باہر کام کریں گی تو وہ نہ تو گھر پر توجہ دے سکیں گی نہ ہی بچوں پر۔ نتیجتاً" آپ کے ابو بھی چڑچڑے رہیں گے اور آپ بھی محرومی کا شکار رہیں گی۔

آپ کے والدین کو اس مسئلے پر ضرور سوچنا چاہئے کہ آخر جب اللہ کا دیا ہوا سب کچھ ہے تو آپ کی امی کو ملازمت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ دراصل آج کے دور کا المیہ ہی یہی ہے کہ گھر کے اندر سازوسامان تو بہت ہے لیکن کمی ہے تو صرف سکون کی۔

میری نظر میں آپ کے مسئلے کا حل یہی ہے کہ آپ امی ابو کے رویّہ پر دل چھوٹا نہ کریں۔ بس ہر وقت اس احساس کو اجاگر رکھیں کہ "ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والا رب" آپ کی شہہ رگ سے زیادہ قریب ہے اور آپ کے تمام کاموں سے بھی باخبر ہے۔ بس..... اب آپ اللہ کی خوشنودی کی خاطر اپنے امی ابو کا بہت زیادہ احترام کیجئے! ان سے محبت کا رویّہ رکھئے جیسے ہی ان کے گھر آنے کا وقت ہو ان کے کمرے کو ٹھیک ٹھاک کردیجئے۔ اپنی مسکراہٹ سے ان کا استقبال کیجئے اور پھر ان کے چھوٹے موٹے کام کو اپنا شعار بنالیجئے۔ حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے "نیک اولاد ماں باپ پر محبت بھری ایک نظر ڈالتی ہے تو اس کے بدلے خدا اس کو ایک حجِ مقبول کا ثواب بخشتا ہے۔ لوگوں نے پوچھا کہ یارسول اللہ اگر کوئی دن میں سو بار اسی طرح رحمت و محبت کی نظر ڈالے؟ آپ نے فرمایا! جی ہاں۔" یقین جانیے کہ اگر آپ دنیا کی چند روزہ زندگی کو مدِنظر رکھ کر صبر کرتی رہیں گی تو ان سے نیک سلوک کرنے کا لطف ہی دوسرا ہوگا اور ویسے بھی قرآن کریم کی آیت ہے کہ "بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔" میرا تو یہی مشورہ ہے کہ آپ اپنے والدین کی خوشنودی کے لئے حکمت سے کام لیجئے۔ اور چھوٹے موٹے کاموں کو اس انداز سے کیجئے کہ وہ آپ بہن بھائیوں کے وجود کو محسوس کریں اور پھر ان کا وقت دفتروں کے بجائے آپ کے درمیان گزرے گا اور وہ آپ کے غم کو اپنا غم اور آپ کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھیں گے انشاءاللہ۔

یہ اسی وقت ممکن ہے۔ جب آپ اپنی سیرت اور حسنِ سلوک سے ان کے دل میں جگہ پیدا کریں۔

امتحان آ گیا

زاہد الحسن زاہد

نہ جاؤں گا اب کھیلنے کو چمن
کسی چیز سے اب نہیں ہے لگن
پڑھائی میں ہر دم رہوں گا مگن
کہ سر پر مرے امتحاں آ گیا

نہ ہوگا کئی ہفتے اب راگ رنگ
اُڑے گی نہ کوٹھے سے میری پتنگ
کسی دوست سے اب کروں گا نہ جنگ
کہ سر پر مرے امتحاں آ گیا

نہیں ہے مجھے کھانے پینے کا ہوش
نہ بھائیں پراٹھے نہ بسکٹ نہ توش
کہاں کھیلنے کا رہا دل میں جوش
کہ سر پر مرے امتحاں آ گیا

مجھے جاں سے پیاری ہے میری کتاب
یہ انگلش یہ تاریخ و اردو حساب
مجھے امتحاں میں ہے دینا جواب
کہ سر پر مرے امتحاں آ گیا

نہ پڑھ لوں گا جب تک کتابیں تمام
کروں گا نہ ہرگز کوئی اور کام
ہیں بس آج سے مجھ پر نیندیں حرام
کہ سر پر مرے امتحاں آ گیا

آخری قسط

وہ کیا راز تھا؟

محمد عمر احمد خان

بھائی کی چیخ سنتے ہی کتاب جواد کے ہاتھوں سے چھوٹ کر نیچے جا گری ٹرین میں اس کے ہم سفر شیر بہادر صاحب ایک پراسرار شخصیت ثابت ہوئے۔ انہوں نے کسی عجیب و غریب صلاحیت سے ٹکٹ کا نمبر تبدیل کر دیا.......... اسلام آباد میں ٹھہرنے کے لئے انہوں نے جواد کو ہوٹل اسپا کا کارڈ دیا جو بعد میں "ہوٹل اسپائیڈر" نکلا۔ وہاں آٹھ کا ہندسہ گردش کر رہا تھا اور مکڑیوں پر حیرت انگیز تجربات کئے جا رہے تھے۔

چھوٹی چھوٹی مکڑیاں سفید سفوف کھا کر بڑی بڑی بدہیت عفریتوں میں تبدیل ہو گئیں انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے ہوٹل میں موجود لوگوں کو مار ڈالا لیکن لاشیں زندہ ہو گئیں۔ مر کر زندہ ہونے والوں نے آبِ حیات سے غسل کیا تو سب کے زخم بھر گئے۔ ٹرکوں سے چپٹی ناک والے عجیب و غریب بونے اتر رہے تھے۔ بونوں کی یہ عجیب و غریب نسل پوری دنیا پر حکومت کرنے کا خواب دیکھ رہی تھی.......... ہرے رنگ کا مشروب پیتے ہی جواد کو کچھ ہوش نہ رہا جب ہوش آیا تو وہ راولپنڈی اسٹیشن کی ایک بنچ پر پڑا تھا اور ہاتھوں میں تین تین انگلیوں کا اضافہ ہو چلا تھا اسے سپاٹ عمارتوں پر مکڑی کی طرح اترنے چڑھنے کی صلاحیت حاصل ہو گئی تھی لیکن سب سے حیرت انگیز صلاحیت ٹیلی پیتھی تھی ایک ایسا علم جو دنیا میں نایاب ہے۔ ایک پراسرار ہیٹ والا مسلسل جواد کا تعاقب کر رہا تھا اور جب جواد نے آگ میں گھری ہوئی عمارت سے بچے کو بچایا تو اس ہیٹ والے نے طاقتور کیمرے سے جواد کی کئی تصاویر کھینچ لیں۔ راولپنڈی کا گجر بدمعاش اس کے ساتھی اور ایک کوچ کا کنڈیکٹر جواد کی ٹیلی پیتھی کا نشانہ بنے جس بچے کو جواد نے آگ میں جلنے سے بچایا تھا وہ اسے فرشتہ سمجھ رہا تھا۔ جواد بچے کی معصومیت اور ذہانت

سے متاثر ہو کر ہسپتال پہنچ گیا۔ وہاں اس نے بچے کے سامنے ٹیلی پیتھی کا مظاہرہ کیا اور بتایا کہ بچے کی والدہ اس وقت کہاں ہیں؟ .... ہوٹل اسپائیڈر اور خود اپنے جسم میں ہونے والی حیرت انگیز تبدیلیوں پر سے پردہ اٹھانے کے لئے جب جواد نے شیر بہادر صاحب کے دماغ میں پہنچنے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ شیر بہادر صاحب کا دماغ خاموش ہو چکا ہے......

ایوانِ صدر کے باہر عوام مہنگائی کے خلاف مظاہرہ کر رہے تھے۔ جواد صدر صاحب کے دماغ میں پہنچ گیا جہاں وزیر اعظم سمیت غیر ملکی سرمایہ داروں کی اہم میٹنگ ہو رہی تھی۔ جواد نے ٹیلی پیتھی کا مظاہرہ کیا تو وہاں ایک ہڑبونگ سی مچ گئی۔ پراسرار ہیٹ والے کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی جواد کی نگرانی کر رہے تھے۔ ہوٹل میں ایک ایسا ہی شخص جواد سے آ ٹکرایا اور جواد اس کے دماغ میں پہنچ گیا۔ جواد چپکے چپکے اس کے دماغ کو پڑھ رہا تھا۔ بڑے حیرت انگیز انکشافات ہو رہے تھے۔ وہ ہوٹل اسپائیڈر کے راز کے قریب پہنچ رہا تھا کہ دو فائر ہوئے۔ ہوٹل میں موجود لوگوں میں سراسیمگی پھیل گئی۔ اسی وقت دو ڈھاٹا بردار کلاشن کوفیں اٹھائے ہوٹل میں داخل ہو گئے............!!

(اب آگے پڑھئے)

ان میں سے ایک مین گیٹ کے پاس کھڑا ہو گیا جبکہ دوسرے نے آگے بڑھ کر ہوٹل کے منیجر کا گریبان پکڑ لیا پھر اس نے منیجر کو دو تین جھٹکے دیئے تو وہ بے چارہ ہکلانے لگا۔ "کک ...... کک ...... کون ہو تم ...... کک ...... کک ...... کیا چاہتے ہو؟"

منیجر کی بات سن کر ڈھاٹا بردار نے اپنی نقاب الٹ دی۔ "پہچانا مجھے؟"

"ہاں ہاں پہچان لیا تم شوکی ہو شوکت!" منیجر تھوک نگل کر بولا۔ شوکی نے ایک زور دار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کیا وہ الٹ کر کاؤنٹر پر جا گرا۔ "یاد ہے آج مہینے کی کیا تاریخ ہے اور پھر بھی پیسے ہمارے بندوں تک نہیں پہنچے ...... تمہیں معلوم ہے جب مقررہ وقت میں پیسے ہم تک نہ پہنچیں تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟" یہ کہتے ہوئے اس نے گرے ہوئے منیجر پر کلاشن کوف سیدھی کر لی۔

جواد شوکی کے لب و لہجے کو پکڑ کر اس کے دماغ میں پہنچ چکا تھا اور اس عرصے میں اس کے دماغ میں رہ کر اس کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات بھی حاصل ہو گئی تھیں۔ وہ ایک سیاسی پارٹی کا کارکن تھا۔ بدمعاشی، دھونس اور جبر کے ذریعے لوگوں سے بھتہ وصول کرتا تھا۔ وہ شرابی، جواری غرض کہ ہر قسم کی برائی میں مبتلا تھا۔ اب اس کا علاج ضروری ہو گیا تھا۔ اسی لئے ...... جیسے ہی اس نے منیجر پر کلاشن کوف تانی جواد اس کے دماغ پر مکمل طور پر قابض ہو گیا اس نے کلاشن کوف زمین پر پھینک دی اور ہاتھ پاؤں ہلا کر ناچنے لگا پھر ناچتے ناچتے بولا۔ "جب مقررہ وقت تک ہمیں بھیک نہ ملے تو ہم ہیجڑوں کی طرح ناچنے لگتے ہیں بالکل اس طرح جیسے ٹی وی پر نوجوان ہیجڑے ناچتے ہیں۔" اتنا کہہ کر وہ بھونڈی آواز میں گانے لگا۔

"دل لگایا تھا دل لگی کے لئے ...... بن گیا روگ زندگی کے لئے......!!"

اس کے ساتھی نے بڑے حیران اور پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھا پھر چیخ کر بولا۔ "یہ کیا ہو گیا ہے شوکی تجھے ...... کیا نشہ تیرے دماغ پر چڑھ گیا ہے۔"

شوکی نے ناچتے ناچتے کہا۔ "طاقت کا نشہ ہوتا ہی ایسا ہے کہ دماغ پر چڑھ جاتا ہے لیکن میں تو اسٹیج پر چڑھ کر ناچ رہا ہوں آؤ تم بھی میرے ساتھ آ کر ناچو...... اور ہاں یہ کلاشن پھینکو اور کہیں سے کوئی ڈھول یا چمٹا پکڑ لو تو بہت پیسے ملیں گے۔"

"لعنت ہو شوکی تجھ پر مجھے نہیں معلوم تھا کہ نشے کی حالت میں ہیجڑے بن جاؤ گے۔" "تو نے مجھے ہیجڑہ کہا...... نوجوان ناچنے والوں کی توہین کی ...... میں تیرا خون پی جاؤں گا ...... میں ہیجڑہ نہیں فخر بائی ہوں۔" اتنا کہہ کر شوکت غصے کی حالت میں اپنے ساتھی پر جھپٹا۔ اسی وقت جواد نے اس کے ساتھی کے دماغ میں پہنچ کر فائر کھول دیا۔ "تڑتڑ............ تڑڑڑ!! تین گولیاں شوکی کے سینے پر لگیں۔ "آہ!" شوکی لڑکھڑایا اس کی انتڑیاں کٹ رہی تھیں اور انگارے سے سینے میں دہک رہے تھے پھر لڑکھڑاتے لڑکھڑاتے وہ خون میں لت پت ہو کر نیچے زمین پر گر پڑا۔

ہوٹل میں موجود لوگ حیران و پریشان سحر زدہ انداز میں اس صورتحال کو دیکھ رہے تھے۔ شوکی مر گیا تھا اور اس کا ساتھی اس کی لاش پر جھکا رو رہا تھا چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ اس نے اسے نہیں مارا ہے۔

ہوٹل میں بھنبھناہٹ ہونے لگی تھی۔ لوگ آپس میں باتیں کرنے لگے تھے۔ جواد کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ کاؤنٹر پر پیسے ادا کئے منیجر بہت بدحواس ہو رہا تھا۔ جواد نے اسے تسلّی دی اور کہا کہ وہ پولیس کو فون کر دے۔ سب صحیح ہو جائے گا۔ فائرنگ کی آواز سن کر اور لوگ بھی ہوٹل کے اندر آ رہے تھے۔

"کیا ہوا؟" "عجیب ہی واقعہ ہو گیا...... شوکی بدمعاش کو اسی کے ساتھی نے مار دیا ہے۔" "کیوں مار دیا؟" "ناچنے گانے پر" جتنے منہ تھے اتنی ہی باتیں ہو رہی تھیں۔ جواد لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ باہر آتے ہوئے اس نے چور نظروں سے دیکھا۔ مسٹر شاہانی اپنی سیٹ چھوڑ کر اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ "یقیناً اور دوسرے نگرانی کرنے والے بھی یہیں کہیں موجود ہوں گے۔" جواد نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سوچا لیکن کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ وہ کچھ دور تک چلا پھر ایک پان کی دکان پر رُکا۔ دکاندار سے میٹھا پان بنوایا۔ پان والا جب تک پان بنا تا رہا جواد مسٹر شاہانی کے دماغ میں موجود رہا اور اس کے دماغ میں مختلف سوچیں پیدا کرتا رہا ایک سوچ نے اس نے یہی پیدا کی کہ جواد کی نگرانی کرنے والے بقیہ افراد اس وقت کہاں ہیں؟ یہ سوچ پیدا ہوتے ہی مسٹر شاہانی نے گردن گھما کر اپنے بائیں جانب دیکھا۔ دور ایک سفید رنگ کی کار نظر آ رہی تھی۔ اس کار کے قریب ہی ہیٹ اوڑھے اوور

کوٹ میں ملبوس کوئی شخص کھڑا تھا۔ شاہانی کے دماغ سے پتا چلا کہ ہیٹ والے شخص کا نام پرویز ہے اس کے ساتھ دو گنجے ہیں جو ماہر ننجے ہیں وہ دونوں یوگا اور جوڈو کراٹے کے ماہر ہیں۔ انہیں جاپان سے حاصل کیا گیا ہے۔ جب نگرانی کا کام مکمل ہو جائے گا تو وہ طاقت کے زور پر جواد کو واپس ہوٹل اسپائیڈر لے جائیں گے۔

یہ بات تو جواد کی سمجھ میں آ رہی تھی کہ اس پر ٹیلی پیتھی اور مکڑیوں کی طرح بلند و بالا عمارتوں پر چڑھنے کا کامیاب تجربہ کیا گیا ہے۔ "لیکن تجربہ صرف مجھ ہی پر کیوں کیا گیا اس کے لئے تو اسپائیڈر ہوٹل والوں کو اعلیٰ درجے کے ذہین اور طاقت ور افراد بھی مل سکتے تھے۔"

اسی سوچ کے درمیان پان والے نے پان کا بیڑا بنا کر جواد کے ہاتھ میں تھما دیا۔ جواد نے پان منہ میں رکھا۔ دکان دار کو پیسے ادا کئے اور پان چباتا خراماں خراماں وہاں سے چل پڑا۔ مسٹر شاہانی بھی چہل قدمی کے انداز میں دوسری فٹ پاتھ پر اس کا تعاقب کرنے لگا۔ جواد اس کے دماغ میں گاہے بگاہے جاتا رہا اس کے دماغ سے ایک بات یہ پتا چلی کہ اس کے پاس پاکٹ سائز ایک ڈائری ہے جس میں اس نے اپنی یاداشتیں محفوظ کر رکھی ہیں۔ جواد اس ڈائری سے متعلق کوئی نئی سوچ اس کے دماغ میں پیدا کرنا چاہتا تھا لیکن بیچ میں مین روڈ تھا۔ گاڑیاں چل رہی تھیں۔ جواد شور کی وجہ سے ڈسٹرب ہو رہا تھا۔

وہ چاہتا تھا کہ کسی پر سکون جگہ بیٹھ کر مسٹر شاہانی کی ڈائری کو پڑھا جائے پھر چلتے چلتے اچانک ہی سامنے ایک لائبریری آ گئی۔ یہ لائبریری بڑے پر سکون علاقے میں تھی۔ دور دور اِکّا دُکّا بنگلے تھے جن میں سے کچھ زیرِ تعمیر تھے۔ لائبریری دیکھ کر جواد کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔

لائبریری کھلی ہوئی تھی جواد اس کے مین گیٹ سے اندر داخل ہوا۔ سامنے ایک بڑا سا ہال تھا جہاں میزیں کرسیاں بچھی تھیں۔ میزوں پر مختلف تازہ اخبار و رسائل بکھرے پڑے تھے لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ وہاں ایک بھی مطالعے کا شوقین نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایک کونے میں لائبریرین اکیلا بیٹھا مکّھیاں مار رہا تھا جواد نے لائبریرین کو سلام کیا اور دھیمے دھیمے چلتا ہوا ایک میز کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا پھر سامنے پڑا ہوا ایک اخبار اٹھایا اور بظاہر بڑی دلچسپی سے اس کا مطالعہ کرنے لگا۔ مطالعہ کرتے وقت جواد کی توجہ لائبریری کے دروازے پر ہی مرکوز تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ مسٹر شاہانی لائبریری میں ضرور آئے گا...... اور پھر چند ہی سیکنڈ بعد شاہانی لائبریری میں پہنچ گیا۔ اس نے کن انکھیوں سے جواد کی طرف دیکھا جو اخبار کے مطالعے میں غرق تھا پھر دروازے کے بائیں طرف والی میز منتخب کر کے کُرسی پر بیٹھ گیا اور بظاہر ایک فلمی رسالے کا مطالعہ کرنے لگا...... اسی وقت جواد چپکے سے اس کے دماغ میں پہنچ گیا چونکہ وہ یوگا کا ماہر نہیں تھا اس لئے جواد کی سوچ کو محسوس نہیں کر سکتا تھا۔

جواد نے اس کے ذہن میں پہلے تو مختلف سوالات پیدا کئے ایک یہ کہ ہیٹ والا اور اس کے گنجے ساتھی اندر کیوں نہیں آئے دوسرے یہ کہ وہ ڈائری ہر وقت اپنے ساتھ کیوں رکھتا ہے؟ ان سوالوں کے جوابات اس کے ذہن میں پیدا ہوئے وہ یہ تھے کہ ہیٹ والے کا کام ختم ہو گیا ہے وہ واپس چلا گیا ہے لیکن اس کے ساتھی لائبریری کے آس پاس موجود ہیں اور یہ کہ اسے بھول چوک کی عادت ہے اس لئے ہر بات ڈائری میں لکھنے کی غرض سے ڈائری اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ پھر اس نے کن انکھیوں سے جواد کی طرف دیکھا جو اخبار پڑھنے میں مگن تھا۔ "کسی کی نگرانی کرنا دنیا کا مشکل ترین اور صبر آزما کام ہے اب یہ پتا نہیں کب تک لائبریری میں بیٹھا رہے گا؟" جواد نے اس کے ذہن میں سوچ پیدا کی پھر اس سے رسالہ میز پر رکھوایا اور اس کی سوچ میں کہا "ہاں جب تک یہ کم بخت اخبار پڑھتا رہے گا مجھے اس فلمی رسالے میں کیا خاک مزا آئے گا۔ رسالہ بھی کم بخت چڑیلوں جیسی صورتوں سے بھرا پڑا ہے۔ مجھے اپنی ڈائری پڑھنا چاہئے۔" اس نے رسالہ میز پر رکھ دیا اور جیب سے ڈائری نکال کر اس کے اوراق الٹنے لگا۔ ایک صفحہ پر لکھا تھا۔ "پاکستان میں اسرائیل کو عنقریب تسلیم کر لیا جائے گا اس کے لئے ایسی حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے گا جو ہمارے صدر کے کہنے پر اسرائیل کو تسلیم کر لے گی۔" ایک اور صفحے پر کشمیر اور فلسطین کے بارے میں معلومات درج تھیں۔ اسی ڈائری میں ایوانِ صدر، پرائم منسٹر، بڑے بڑے وزیروں اور فوجی آفیسروں کے پتے اور ٹیلی فون نمبرز لکھے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں کچھ ناموں پر سرخ نشانات لگائے گئے تھے۔ جواد نے اس کے ذہن میں یہ خیال پیدا کیا کہ سرخ نشانات کیوں لگائے گئے ہیں؟ اس خیال کے آتے ہی اس کی جوابی سوچ نے بتایا کہ اس ملک میں جو سیاستدان، وزیر اور فوجی محبِّ وطن ہیں انہیں اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے ہٹانا ضروری ہوتا ہے چنانچہ اس کی ڈائری میں چند ایسے ہی محبِّ وطن افراد کے نام ہٹ لسٹ پر موجود ہیں۔ جواد نے ان میں سے چند نام اپنے ذہن میں نوٹ کر لئے۔ مسٹر شاہانی صفحات اُلٹ پلٹ رہا تھا پھر ایک صفحے پر جواد نے اسے روک دیا وہاں ایک ہیڈنگ لیڈ کی شکل میں لگی ہوئی تھی۔ "جواد کے بارے میں معلومات" نیچے جواد کا بایو ڈیٹا تھا:

مکمل نام: جواد علی

ولدیت: شہزاد علی

قد: تقریباً چھ فٹ

تعلیمی قابلیت: ایم اے (اکنامکس)

رہائشی مقام: کراچی

آگے لکھا تھا۔

"دنیا پر قبضہ کرنے کے لئے جس خون کی ہمیں ضرورت ہے وہ جواد کے جسم میں موجود ہے۔ جواد سے پہلے برطانیہ سے ایک نوجوان پیٹر تجربے کے لئے حاصل کیا گیا تھا لیکن وہ چند دنوں بعد مر گیا اسے ایڈز کا مرض تھا...... یہ مرض اتنا

خطرناک ہے کہ "آبِ حیات"۔۔۔۔۔۔ پینے والا بھی اس سے نہیں بچ سکتا۔ اس نوجوان کے مرنے کے بعد دنیا بھر میں اس خون کے حامل لوگ ہم نے ڈھونڈ لئے تھے لیکن سخت مایوسی کا سامنا تھا پھر اچانک ہی پاکستان میں ایک نوجوان دریافت کر لیا گیا جس کے خون پر ہمارے تجربے کی کامیابی کا دارومدار تھا۔ جواد کی دریافت کا سہرا بلاشبہ میں مسٹر شیر بہادر کو دوں گا۔ انہوں نے کراچی شہر میں ایک ہنگامی صورتحال کے دوران جواد کو اچانک دریافت کیا۔ بوہری بازار صدر میں بم کا دھماکہ ہوا تھا۔ ہسپتال زخمیوں سے پٹ گئے تھے۔ زخمیوں کے لئے خون کی اشد ضرورت تھی۔ اس ہنگامی صورتِ حال میں ہمارے آدمی ہمیشہ اس خون کی تلاش میں رہتے ہیں جو دنیا میں نایاب ہے۔ جواد خون کا عطیہ کرنے والے چند پُرجوش نوجوانوں کے ساتھ آیا اور اس کا خون لینے کے دوران یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ وہ تجربے کے لئے موزوں رہے گا۔ جن لوگوں میں یہ خون موجود ہو انہیں آبِ حیات پلانے سے ان کی اندر دماغی صلاحیتیں ایک دم سے کئی درجے بڑھ جاتی ہیں اور وہ دوسروں کے دماغوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ اسی کا نام ٹیلی پیتھی ہے۔"

صفحے کی آخری لائنیں پڑھنے کے بعد جواد کو اپنے خون دینے کا واقعہ یاد آ گیا لیکن اس نے ڈائری پڑھنے کے عمل کو جاری رکھا اور اگلا صفحہ پلٹا۔ چند لائنوں میں لکھا تھا: "ہمارے سائنس دان حد بندی کرنے کے ماہر ہیں۔ چیز سامنے ہی موجود ہوتی ہے لیکن نظر نہیں آتی ہے۔"

اس سے اگلے صفحے پر درج تھا:

۵ دسمبر

"تجربہ سوفیصدی کامیاب رہا ہے ہمارے تمام سائنس دان اس تجربے پر بے حد خوش ہیں۔ ایک خاص قسم کا مشروب جواد کو پلایا گیا ہے جس کی وجہ سے اب وہ ہمارا آدمی ہے۔ آٹھ کا ہندسہ ہماری زندگیوں میں مقدس حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے جھنڈے میں بھی آٹھ کونوں والے ستارے موجود ہیں۔ جسے بھی خاص مشروب پلایا جائے اس کے ہاتھ اور پیروں میں تین تین اُنگلیاں مزید بڑھ جاتی ہیں۔ اب وہ ہمارے گروہ کا آدمی مانا جاتا ہے۔ جواد اب ہمارے گروہ کا خاص آدمی ہے ہمارے سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ ابھی اس کا دماغ ہمارے قابو میں نہیں لیکن انہوں نے خوشخبری دی ہے کہ عنقریب جواد ان کی مرضی کے تابع ہو گا۔ وہ اس کے دماغ کا ایک خاص آپریشن کریں گے!!"

یہ صفحہ یہاں ختم ہو گیا تھا چنانچہ جواد نے اس سے اگلا صفحہ پلٹا:

۶ دسمبر

"میرے ذمہ جواد کی نگرانی کا کام سونپا گیا ہے۔ جو میرے لئے کسی اعزاز سے کم نہیں اور لوگ بھی اس کام کی نگرانی کریں گے اور جواد کے ذہن میں پیدا ہونے والی اس عجیب و غریب

صلاحیت کا تفصیلی جائزہ لیں گے جس کا نام "ٹیلی پیتھی" ہے۔ ایک اور صلاحیت جو جواد میں پیدا ہوئی ہے وہ سپاٹ عمارتوں پر مکڑیوں کی طرح چڑھنے اُترنے کی ہے۔ ارم پیلس میں، میں نے یہ مظاہرہ دیکھا ہے...... نہایت حیرت انگیز..........!!"

۷ دسمبر

"یہ لڑکا بہت تیز جا رہا ہے۔ اس نے ٹیلی پیتھی کے نادر نمونے پیش کئے ہیں واقعی ٹیلی پیتھی ایک زبردست صلاحیت ہے اس صلاحیت کی مدد سے ہم دنیا کے تمام ذمہ داران کے دماغوں میں جھانک کر ان کی قومی سلامتی کے اہم راز معلوم کر سکتے ہیں۔ سب سے مزے کی بات یہ ہے کہ جواد کو سب سے پہلے اپنے ملک کے خلاف استعمال کیا جائے گا۔"

"ایکس کیوز می پلیز!" جواد ڈائری کا اگلا صفحہ دیکھنا ہی چاہتا تھا کہ آواز سن کر اسے مسٹر شاہانی کے دماغ سے واپس آنا پڑا۔ جواد نے گردن اُٹھا کر دیکھا۔

اس کے سامنے ایک دُبلا پتلا مسکین سا شخص کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ٹرے تھی جس میں "عطر کی چھوٹی چھوٹی شیشیاں دھری تھیں۔ وہ جواد کے بالکل قریب کھڑا تھا اور تیز خوشبوئیں جواد کی ناک میں گھُسی جا رہی تھیں۔

"بابو جی! عطر چاہئے ...... میرے پاس ہر طرح کا عطر ہے، عطر گلاب، عطر موتیا ، عطر نرگس، اور یہ ایک خاص قسم کا عطر ہے۔" اس نے ایک چھوٹی سی شیشی جواد کے ہاتھ پر دھر دی۔ "اور یہ اس کے استعمال کی ترکیب ہے۔" اس نے ایک چھوٹا سا رقعہ جواد کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ جواد نے رقعہ پر نظر دوڑائی اور چونک اُٹھا۔ رقعے پر لکھا تھا:

"میرا نام خضر ہے...... میں شیطانی قوتوں کے خلاف سرگرمِ عمل رہتا ہوں۔ یہ جو عطر کی شیشی میں نے آپ کو دی ہے دراصل عطر نہیں ایک زود اثر محلول ہے۔ آپ کو جس شیطانی قوت نے یہ مشروب پلایا ہے اس میں پراٹیسیم، ایمبا اور مکڑیوں کا گوشت پیس کر شامل کیا گیا ہے۔ اس مشروب کے پینے سے آپ میں زمین کا خدا بننے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔ آپ انسان ہیں اللہ کے فرماں بردار بندے ہیں اس لئے یہ زود اثر مشروب پی لیجئے شیطانی اثرات سے آزاد ہو جائیں گے۔ میں آپ کا دوست ہوں...... اگر آپ کو میری باتوں پر یقین نہیں آتا تو میرے دماغ میں آ کر یقین کر لیں!!"

وہ عطر والا وہ نہیں تھا جو نظر آ رہا تھا اک دم سے خاص بن گیا تھا۔ جواد نے فوراً خیال خوانی کی پرواز کی اور اس کے دماغ میں جگہ بنائی۔ وہاں ایک ہی صدا گونج رہی تھی:

"اللہ اکبر...... اللہ اکبر...... اللہ بڑا ہے...... اللہ بڑا ہے......!!"

جو شخص اللہ کی بڑائی کا اقرار کر رہا ہو وہ جھوٹ نہیں بول سکتا" جواد سوچنے لگا۔ "سوچ کیا رہے

ہیں صرف پانچ روپے کی شیشی ہے خرید لیجئے اور پی لیجئے!" آخری جملہ اس نے بڑی آہستگی سے کہا۔ پھر وہ مسٹر شاہانی کی طرف چلا گیا اور اسے عطر خریدنے کے لئے راضی کرنے لگا۔ جواد سمجھ گیا کہ وہ مسٹر شاہانی کو باتوں میں مصروف رکھنا چاہتا ہے تاکہ جواد محلول پی لے چنانچہ مسٹر شاہانی سے نظر بچا کر اس نے بوتل کا ڈھکن کھولا اور محلول پی لیا۔ پانی کی طرح کا محلول تھا لیکن اس میں گلاب کی سی خوشبو تھی۔ محلول پیتے ہی اس کو یوں لگا جیسے اس کے سینے پر ایک بوجھ تھا جو اب کم ہو گیا ہے۔

"محلول آپ نے پی لیا؟" عطر والے نے جواد کے قریب پہنچ کر کہا۔ "ہاں!" جواد نے اثبات میں سر ہلایا۔ "یہ لیجئے مسٹر شاہانی کی ڈائری اور لائبریری کے پچھلے گیٹ سے باہر نکل جائیے اس سے پہلے کہ وہ دونوں گنجے اندر آئیں۔"

"لیکن مسٹر شاہانی......!!" "اس کی پروانہ کیجئے......!" عطر والے نے بات کاٹی مسٹر شاہانی کو میں نے زہریلی سوئی چبھو کر ختم کر دیا ہے۔ وہ دیکھئے کتنے مزے سے کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی سو گیا ہے۔" اس کے الفاظ پورے ہی ہوئے تھے کہ ایک کرخت آواز سنائی دی "اور اب ہم تمہیں موت کی نیند سُلائیں گے۔"

جواد اور عطر والے نے گردن گھُما کر دیکھا۔ دونوں گنجے اندر آگئے تھے اور انہوں نے آخری جملے سن کر ساری صورتحال بھانپ لی تھی۔ اس وقت وہ دونوں کالے رنگ کے چُست لباس میں تھے۔ ایسے لباس میں جو ماہر ننجا پہنتے ہیں۔ ان کے جسم پر مختلف وضع قطع کے ہتھیار سجے تھے پھر دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اپنی کمر کے قریب لگے پٹکے سے چمکتی ہوئی تلواریں نکال لیں اور بڑی تیزی سے خضر پر حملہ آور ہوگئے۔ دونوں کی تلواریں خضر پر برسیں لیکن وہ بجلی کی سی رفتار سے اس جگہ سے ہٹ گیا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں تلواریں آپس میں ٹکرا گئیں۔

ننجاوں نے بڑی جلدی اپنے آپ کو سنبھالا اور دوسرا حملہ کیا لیکن اس میں بھی ناکامی ہوئی خضر چھلانگ مار کر ایک میز کے نیچے گھس گیا۔ ایک ننجے نے ڈائیو مار کر پوری قوت سے تلوار کا ہاتھ چلایا اور ایک ٹانگ کٹ گئی خضر کی نہیں میز کی۔ میز ایک طرف لڑھکا کر خضر دوسری میز پر چڑھ گیا۔ دونوں گنجے ننجا پھر اس کے سر پر پہنچ گئے۔ پھر تلواریں چلیں اور اس بار پھر دو ٹانگیں کٹیں دو کرسیوں کی خضر پھر بچ گیا۔ "جواد میں انہیں اُلجھا کر رکھتا ہوں تم پچھلے دروازے سے نکل جاؤ۔" خضر نے چیخ کر کہا اور اس کی یہ بات سُنتے ہی جواد پچھلے دروازے کی طرف دوڑا لیکن اس سے پہلے ہی ایک ننجا تقریباً اُڑتا ہوا جواد کے سامنے آگیا۔ "تم کہیں نہیں جاسکتے تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔" اس کا لہجہ نہایت کرخت تھا۔ اسی وقت اس کے ساتھی ننجا کی چیخ سُنائی دی خضر نے اس کے پاؤں میں پاؤں ڈال کر اسے نیچے گرا یا۔ تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ خضر نے بڑی

پھرتی سے تلوار اُٹھائی اور اس کا سر قلم کر دیا۔ اس کا سر اُڑتا ہوا اس طرف گیا جدھر لائبریرین بیٹھا کانپ رہا تھا۔ جیسے ہی گنجے ننجا کا سر اس کے سر سے ٹکرایا وہ نیچے گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ اب پتا نہیں سر کے ٹکرانے سے بے ہوش ہوا تھا یا کھوپڑی کے خوف سے۔

"تم نے میرے ساتھی کو مارا میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

دوسرا ننجا چیختا چلاتا خضر کی طرف لپکا۔ خضر نے اس کے بھرپور حملے کو اپنے ہاتھ میں پکڑی تلوار سے روکا اور پھر پینترا بدل کر ایک ایسا زور کا ہاتھ مارا کہ دوسرے ننجا کی گردن بھی کٹ کر دور جا گری "ہائے مار ڈالا ظالم!" اس ننجا کی کھوپڑی نے انگلش میں چیخ کر کہا۔

"بھاگو یہاں سے" خضر نے چیخ کر جواد سے کہا۔ دونوں بھاگتے ہوئے لائیبریری کے پچھلے دروازے سے باہر نکلے۔ جیسے ہی باہر نکلے عین دروازے کے سامنے پہلے مرنے والے ننجا کا دھڑ لڑکھڑایا اس ننجا کی بغل میں اپنی ہی کھوپڑی دبی ہوئی تھی جو زور زور سے قہقہے لگا رہی تھی۔ "ہاہاہاہا .... ہاہاہاہا!!" جواد اور خضر واپس لائیبریری کی طرف مڑے لیکن وہاں دروازے پر دوسرا ننجا اپنی کھوپڑی کسی فٹ بال کی طرح پکڑے کھڑا کہہ رہا تھا۔ "ہمیں کوئی نہیں مار سکتا ہم نے سفید سفوف کھایا ہے۔"

"بھاگو .... یہ کم بخت شیطانی جسم ہیں۔" جواد اور خضر سامنے کھڑے ہوئے ننجا کو ڈاج کر کے بڑی بد حواسی میں سامنے روڈ کی طرف بھاگے۔ شام ہو چلی تھی سردی کی وجہ سے روڈ سنسان ہو رہا تھا لیکن ایک گاڑی بڑی تیزی سے آ رہی تھی۔ اس کے ڈرائیور نے اچانک اپنے سامنے دو بندوں کو بد حواسی کے عالم میں روڈ کراس کرتے ہوئے دیکھا تو ہنگامی بریک لگائے۔ ایک بندہ تو تیزی میں گاڑی کراس کر گیا جب کہ دوسرا بُری طرح گاڑی سے ٹکرا کر نیچے گر گیا۔ ڈرائیور نے گاڑی روک لی پھر جیسے ہی وہ گاڑی سے اُترا اسے اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا۔ دو بغیر سر کے آدمی اپنی گنجی کھوپڑیاں ہاتھوں میں سنبھالے اس کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ خوف و دہشت سے اس کی آنکھیں کُھلی کی کُھلی رہ گئیں اور وہ گاڑی کے کھلے دروازے پر لٹک گیا۔

جواد بڑی تیزی سے بھاگ رہا تھا پیچھے دونوں سر کٹے بھاگے چلے آ رہے تھے۔ بھاگتے بھاگتے جواد ایک جگہ گر پڑا اسی وقت ایک ننجا کی گنجی کھوپڑی اُڑتی ہوئی آئی اور اس کے پتلون کے پائنچے میں اپنے دانت گاڑھ کر لٹک گئی۔ جواد نے اپنے پاؤں کو زور سے جھٹکا دیا۔ تیسری کوشش میں کھوپڑی کے دانت ہل گئے اور وہ لڑھکتی ہوئی نیچے جا گری۔ اسی وقت جب کہ جواد اٹھ کر پھر دوڑنے لگا تھا دوسرے ننجا نے اپنے ہاتھ میں پکڑی کھوپڑی کو اپنے پاؤں سے کسی فٹ بال کی طرح زور سے کک لگائی وہ کھوپڑی اُڑتی ہوئی سیدھی جواد کے کوٹ کے

کالر سے آ چپکی۔ جواد کی چیخ نکل گئی لیکن اس نے اپنے اوسان بحال رکھے۔ گردن گھما کر کھوپڑی کو کان سے پکڑا اور زور سے کھینچا۔ "ہائے میرا کان .... مار ڈالا ظالم........... !!" کھوپڑی انگلش میں چیخنے لگی۔ جواد نے کھوپڑی کی بات سنی ان سنی کر کے اسے کان سے پکڑ کر پھینک دیا۔ "ارے کم بخت یہ تیرا سر ہے۔ اپنا بھوسے والا سر میری طرف بھیج دیا۔ میرا سر دے مجھے۔" ایک کھوپڑی چلا رہی تھی اور دوسرے دھڑ کے پاس جانا چاہتی تھی۔ "صبر کرو........... جواد ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔" اس کھوپڑی نے چیخ کر کہا۔ جواد بھاگتے بھاگتے بے دم ہو چکا تھا، سانس بری طرح پھول گیا تھا سامنے ایک زیر تعمیر عمارت کی سیڑھیاں اندھیرے اجالے میں مدغم سی نظر آ رہی تھی ...... پیچھے سر کٹے اپنی اپنی کھوپڑیاں سنبھالے ہانپتے کانپتے بھاگے چلے آ رہے تھے ...... بڑا خوف ناک سامنظر ...... تھا...... جواد عمارت کے گیٹ سے اندر داخل ہوا ...... گیٹ پر کوئی بندہ یا چوکیدار موجود نہ تھا لڑکھڑاتے قدموں سے وہ دس بارہ سیڑھیاں اوپر چڑھا پھر پاؤں رپٹا تو سنبھل نہ سکا قلابازیاں کھاتا ہوا نیچے گرا۔ گرتے گرتے اس نے محسوس کیا کہ اس کے دستانے اس کے ہاتھوں میں نہیں ہیں اور ہاتھوں میں آٹھ کی جگہ پانچ ہی انگلیاں ہیں۔ چشمہ بھی آنکھوں پر نہیں رہا تھا ...... جواد بری طرح سیڑھیوں سے گرا۔ اسے اپنے سر میں دھماکے سے محسوس ہو رہے تھے۔ نیلی پیلی روشنیاں دماغ میں ناچ رہی تھیں۔ پھر اسے کسی گاڑی کے چلنے، رکنے، کچھ لوگوں کے اترنے، باتیں کرنے کی آوازیں آئیں لیکن وہ انہیں دیکھ نہیں سکتا تھا کیونکہ اس کا ذہن اندھیروں میں ڈوب رہا تھا۔ آخری بات جو اس نے محسوس کی وہ یہ تھی کہ کچھ لوگ اسے اٹھا کر کسی گاڑی میں ڈال رہے تھے پھر جواد کو کچھ ہوش نہ رہا جب ہوش آیا تو وہ ہسپتال میں تھا۔ اس کا جسم پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ اور ایک ٹانگ کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی تھی۔ **اس کے دور پار کے رشتہ دار خالو اس کے بستر کے** قریب بیٹھے تھے۔ جواد کو ہوش میں آتا دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے جواد کے گھر فون کر کے اس کے امی ابو کو بھی بلوا لیا تھا وہ لوگ بہت پریشان تھے لیکن ڈاکٹروں کی حوصلہ افزا رپورٹ پڑھ کر انہیں اطمینان ہوا۔

جواد تقریباً ایک مہینے ہسپتال میں زیر علاج رہا پھر گھر والے اسے کراچی لے آئے۔ "کیا ہوا تھا ...... تم کس طرح زخمی ہوئے تھے؟" ان سب سوالوں کا جواد نے ایک ہی جواب دیا۔ "شاید ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا!" اصل بات وہ گول کر گیا کیونکہ ڈاکٹروں نے ہسپتال سے رخصت دیتے وقت اس کے امی ابو سے کہا تھا "اس کے دماغ میں چوٹ آئی ہے جو ٹھیک تو ہو گئی ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ آپ کا بچہ کبھی بہکی بہکی باتیں کرنے لگے۔" بس یہی سوچ کر جواد نے کسی کو کچھ نہیں بتایا کہ اس کے ساتھ کیا کیا واقعات پیش آئے

اور وہ ایک خطرناک گروہ کے چنگل سے کس طرح بچ نکل آیا ہے...... اور یہ کہ وہ خطرناک گروہ پوری دنیا پر اپنی حکمرانی کے خواب دیکھ رہا ہے......!!

مسٹر شاہانی کے پاس سے ملنے والی ڈائری جواد کے پاس سے غائب ہو گئی تھی۔ "خضر کون تھا کاش وہ مجھے کہیں مل جائے تو میں اس کے ساتھ مل کر اس راز کو بے نقاب کر سکوں۔ پتا نہیں وہ زندہ بھی ہو گا یا.........؟" گاڑی سے ٹکرانے کے بعد اس کا کچھ پتا نہیں چلا تھا۔

جواد نے کئی بار سوچا پھر اس نے مختلف بہانوں سے اسلام آباد کے دو سفر کئے شکر پڑیاں کے کئی چکر لگائے جہاں اس کے خیال میں ہوٹل اسپائیڈر موجود تھا پھر اسے سخت مایوسی ہوئی وہاں اس نام کا کوئی ہوٹل ہی موجود نہیں تھا لیکن جواد کو پورا یقین تھا کہ وہ ہوٹل کہیں آس پاس میں ہی موجود ہے۔ ہوٹل کی تلاش کے دوران اسے مسٹر شاہانی کی ڈائری میں لکھے ہوئے جملے یاد آئے۔ مسٹر شاہانی نے ڈائری میں لکھا تھا.

"ہمارے سائنس دان حد بندی کرنے کے ماہر ہیں چیز سامنے ہی موجود ہوتی ہے لیکن نظر نہیں آتی ہے۔"

جواد کے لئے یہ کوئی خواب نہ تھا۔ اس نے اپنے طور پر تحقیقات کی تھیں ان تاریخوں کے اخبارات اخبار کے دفتر سے حاصل کئے تھے جن میں گجر بدمعاش کی پٹائی کا واقعہ اور ارم پیلس میں آگ لگنے کا قصہ شائع ہوا تھا...... یہ وہ ثبوت تھے جو اس بات کو جھٹلا رہے تھے کہ شاید جواد نے کوئی خواب دیکھا ہے پھر ایک سال کے اندر اندر ملک میں اور عالمی اُفق میں ہونے والی تبدیلیاں، مہنگائی، قتل و غارت گری، اس بات کی طرف اشارہ کر رہی تھیں کہ واقعی کوئی ایسا گروہ موجود ہے جو اپنی پالیسیاں دے کر کسی عفریت کی طرح پوری دنیا کو اپنے شکنجے میں جکڑنا چاہتا ہے۔

اسلام آباد دوسرے سفر کے دوران جواد کو ایک خط موصول ہوا جس میں لکھا تھا۔ "مسٹر جواد! زیادہ ہاتھ پاؤں چلانے کی کوشش نہ کریں۔ اسلام آباد آپ کا تیسرا چکر آپ کے گھر والوں کی زندگی کے چراغ کو گُل کر دے گا۔ آپ خوش قسمت ہیں کہ ہم نے طاقت رکھتے ہوئے بھی آپ کو آزاد کر دیا ہے۔"

پورا کاغذ صرف انہی تنبیہی جملوں پر مشتمل تھا اور خط کے اوپر آٹھ ٹانگوں والی ایک سنہرے رنگ کی مکڑی بنی تھی۔ اس خط کے ملنے کے بعد جواد نے تحقیقات کا خیال دل سے نکال دیا......!!

سب سے بہترین

فروری کے آنکھ مچولی میں قلم دوست کی سب سے بہترین کہانی رفعت اشتیاق کی "ہاں یہ میرا بیٹا ہے" اور سب سے بہترین نظم شہزاد خان کستوری کی "کچے ہو نہ پکے ہو" رہی۔ ہمیں سینکڑوں ساتھیوں کی آرا موصول ہوئیں۔ شکریہ بذریعہ قرعہ اندازی آسیہ منور قلم کی حقدار قرار پائیں۔ انعام حاصل کرنے پر آنکھ مچولی کی طرف سے انہیں مبارک باد!

کوپن صفحہ ۱۲۸ پر

قلم دوست

ان کی تحریریں جو ادیب بننا چاہتے ہیں

روشنی

ایم اعجاز ادیب

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ سارا دن حکومت کا کام کرتے رہے۔ ظہر کی نماز کے بعد آپ نے ارادہ کیا کہ تھوڑی دیر آرام کر لیں کیونکہ آپ بہت زیادہ تھک گئے تھے۔ ابھی بستر پر لیٹے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ آپ کا بیٹا جس کا نام عبدالملک تھا۔ آپ کے کمرے میں آیا اور آپ کو جگا کر بولا۔ "ابا جان آپ آرام کر رہے ہیں اور باہر سارے فریادی آپ کا انتظار کر رہے ہیں"۔ بیٹے کی بات سن کر آپ نے فرمایا۔ "بیٹا سارا دن کام کرنے کی وجہ سے میں بہت زیادہ تھک گیا ہوں ان لوگوں سے کہو کہ تھوڑی دیر انتظار کر لیں میں آرام کر کے ان کی باتیں سنوں گا"۔ عبدالملک بولا۔ "ابا جان بے شک آپ بہت تھک گئے ہیں لیکن اس بات پر غور فرمایئے کہ اگر اسی حالت میں آپ کو موت آ گئی تو خدا کو اس بات کا کیا جواب دیں گے کہ لوگ فریاد لے کر آپ کے پاس آئے تھے اور آپ ان کے مقدموں کا فیصلہ کرنے کی جگہ سوتے رہے تھے۔" آپ نے اپنے بیٹے کی یہ بات سنی تو فوراً بستر سے اٹھ گئے اور اس کی پیشانی چوم کر فرمایا۔ "بیٹا تمہاری یہ بات بالکل ٹھیک ہے کہ انسان کی زندگی کا کچھ اعتبار نہیں۔ نہیں کہا جا سکتا کون سا سانس اس کا آخری سانس ہو۔" یہ فرما کر آپ باہر تشریف لائے اور فریاد کرنے والوں کی باتیں سن کر ان کے مقدموں کا فیصلہ کیا۔

اللہ رب العالمین

شہر بانو بخاری، فیصل آباد

اللہ تیرا نام ہے پیارا
اللہ تیرا کام ہے پیارا

سورج چاند تارے پیارے — تیرے نور سے چمکے سارے
ذرّوں میں بھی تیری ضو — ہر جلوے میں تو ہے تو

اللہ تیرا نام ہے پیارا

تیتر میں تیری حق ہُو — بگلے کی بھی تو میں تُوٗ
کوئل میں بھی تیری کُوٗ — ہر جلوے میں تو ہی تُوٗ

اللہ تیرا کام ہے پیارا

امّی تیرے پیار کی صورت — ہم ہیں تیرے پیار کی بو
ابّو تیرے پیار کی صورت — ہر جلوے میں تو ہی تو

اللہ تیرا نام ہے پیارا
اللہ تیرا کام ہے پیارا

ایک طالب علم کی کہانی

مُنیر احمد۔ نواب شاہ

شاہد کا تعلق ایک غریب فیملی سے تھا۔ وہ بہت محنتی تھا اور ہر کسی کے ساتھ بڑے خلوص، محبت اور شفقت سے پیش آتا تھا۔ اس کے تمام اساتذہ اور اس کے گھر والے اس کی عزّت کرتے تھے۔ وہ تھا بھی تو عزّت کے قابل۔ ہر کام بڑی ہی محنت اور لگن سے کرتا۔ اسکول میں اب تک اس نے ہر جماعت میں اول پوزیشن حاصل کی تھی۔

شاہد آج بہت خوش تھا کیونکہ آج اس کا میٹرک کا رزلٹ آنے والا تھا۔ اسے اُمید تھی کہ وہ اچھے نمبروں سے پاس ہوگا۔ آج اسے اپنے وہ گزرے ہوئے دن یاد آرہے تھے کہ کس طرح اس نے کسمپرسی اور غریبی کی حالت میں اپنی پڑھائی کو جاری رکھا اور تمام مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ اسے آج وہ دن بھی یاد آرہا تھا جب اس نے اپنی کاپیوں، کتابوں اور اسکول فیس کے لئے اخبارات بیچے تھے۔

وہ صبح سویرے اخبار بیچتا اور پھر اسکول جاتا۔ اخبار بیچنے کے دوران کچھ لوگ اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھتے اور کہتے! "یہ اخبار بیچنے والا کیا پڑھے گا۔" لیکن شاہد ایسی حقارت آمیز اور طنز سے بھری ہوئی باتیں سن کر صرف مُسکرا دیتا۔ کیونکہ اسے اپنے خدا پر یقین تھا کہ اسے اس کی محنت کا ثمر ضرور ملے گا اور ایک نہ ایک دن وہ بڑا آدمی ضرور بنے گا۔

شاہد ابھی انہی سوچوں میں گم تھا کہ اس کا دوست انور اس کے پاس اخبار لے کر آیا جس میں اس کا رزلٹ آیا تھا۔

"شاہد تم نے پورے صوبے میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی ہے۔ دیکھو اخبار میں تمہاری

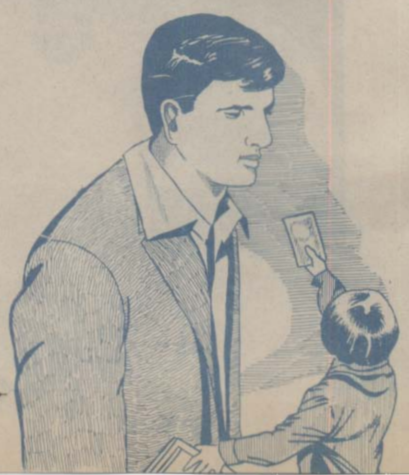

تصویر بھی آئی ہے۔" انور نے شاہد کو بتایا۔

"اچھا! مجھے بھی دکھاؤ" شاہد نے خوشی سے کہا۔

وہ واقعی پورے صوبے میں اول آیا تھا۔

شاہد، انور سے اخبار لے کر اپنی ماں کے پاس گیا اور خوشی سے چلّایا "ماں ...... ماں .... کہاں ہو ماں؟

دیکھو میں تمہارے لئے خوشخبری لایا ہوں۔"

"کیا ہوا بیٹا۔ کون سی خوشخبری ہے؟" ماں ...... ماں نے باورچی خانے سے کہا

"ماں دیکھو میں میٹرک کے امتحان میں فرسٹ آیا ہو۔" شاہد نے ماں کو بتایا۔ "بیٹا! یہ سب کچھ تمہاری محنت کا نتیجہ ہے۔"

ماں نے خوشی سے شاہد کا ماتھا چوم لیا اور ڈھیر ساری دعائیں دینے لگی۔

اعلیٰ نمبروں سے کامیابیاں حاصل کرنے پر حکومت نے شاہد کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ شاہد دل لگا کر نہایت محنت و لگن سے پڑھتا رہا اور چند ہی سالوں بعد وہ ملک کا سب سے لائق اور قابل ڈاکٹر بن چکا تھا۔

وہی لوگ جو اس غریب بچّے کو پہلے حقارت اور تحقیر کی نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ آج اس کے آگے بچھے جا رہے تھے اور بڑی عزت و احترام سے اس سے پیش آ رہے تھے۔ شاہد لوگوں کی نگاہیں پہچانتا تھا لیکن اسے اس بات کی خوشی تھی کہ مسلسل محنت، صبر، برداشت اور ماں کی دعاؤں کی بدولت اسے معاشرے میں عزت کی منزل مل چکی ہے۔

کچھ نہیں چاہئے تجھ سے اے میری عمرِ رواں میرا بچپن میرے جگنو، میری گڑیا لا دے

مرسلہ...... زبیدہ کاظمی، چھبڑ سندھ

ادیب

سارہ مصطفیٰ، کراچی

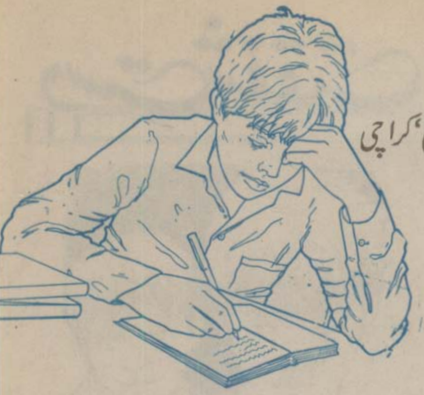

ادیب..... چار لفظوں کا مجموعہ مگر اپنے اندر کتنی وسیع دنیا رکھتا ہے اس کا احساس ہم اور آپ نہیں کر سکتے۔ ادیب نہایت حساس دل و دماغ کا مالک ہوتا ہے۔ ساری خلقت کی سوچ ایک طرف اور ادیب کی سوچ ایک طرف۔ بہترین مصنف کے پاس الفاظ کا ذخیرہ ہوتا ہے اور اس کی نظریں بہت تیز ہوتی ہیں۔ وہ بہت جلد بات کا مقصد سمجھ لیتا ہے اور خوبصورت الفاظ میں ڈھال کر قارئین کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ اگر ہم اور آپ ادیب بننا چاہیں تو نہیں بن سکتے کیونکہ یہ ایک خداداد صلاحیت ہوتی ہے اور کچھ بچے یا کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن میں یہ صلاحیت پوشیدہ ہوتی ہے۔ لیکن اسے پنپنے کا موقع نہیں ملتا۔ اچھے مصنف کی نشانی یہ ہے کہ اگر وہ اپنے غم کا احساس ظاہر کرنا چاہتا ہے تو موسم بہار میں کوکتی کوئل کی کوک میں غم کو شامل کر دیتا ہے جس کو ایک حساس دل رکھنے والا بہت جلد محسوس کر لیتا ہے۔ ادیب کی بات بہت سچی، بہت زیادہ حقیقت سے قریب تر، چھوٹی اور جامع ہوتی ہے۔ اچھے ادیب قوم کا بہترین سرمایہ ہوتے ہیں ہمارے ملک پاکستان کو سچے ادیبوں کی اشد ضرورت ہے کیونکہ جہاد صرف تلوار ہی سے نہیں "قلم" سے بھی کیا جاتا ہے.....!!

وہ اکثر بچوں کو دن میں سُلا دیتی ہے اس لئے گلی میں پھر کھلونے بیچنے والا نہ آ جائے

مرسلہ...... مجیب ربانی، سرائے سدھو

دستِ شفقت

○ جس بچّے کا ہر وقت مذاق اڑایا جائے وہ بزدل بن جاتا ہے۔

○ جس بچّے پر ہر وقت تنقید کی جاتی ہے وہ ہر چیز کو رد کرنا سیکھتا ہے۔

○ جس بچّے پر اعتماد نہیں کیا جاتا وہ دھوکا دینا سیکھ جاتا ہے۔

○ جس بچّے سے شفقت برتی جاتی ہے وہ محبت کرنا سیکھتا ہے۔

○ جس بچّے پر ہر وقت غصہ اتارا جاتا ہے وہ چڑچڑا ہو جاتا ہے۔

○ جس بچّے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اس میں اعتماد بڑھتا ہے۔

مرسلہ : صدف، مظفر، راولپنڈی

جھلمل کرتے ستارے

محمد نعیم ملک

علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد عورت پر فرض ہے۔ حدیثؐ

علم سے محروم بچے
کیا کریں معصوم بچے
سوچتے ہیں یہ غریب
کیوں نہیں ہم خوش نصیب
ہم بھی تو انسان ہیں
ہم کسی کی جان ہیں
علم سے محروم ہیں
اس لئے معصوم ہیں
علم کی دولت ملے
ہم کو بھی عظمت مِلے
دل میں ہے یہ آرزو
علم سے ہوں سرخرو

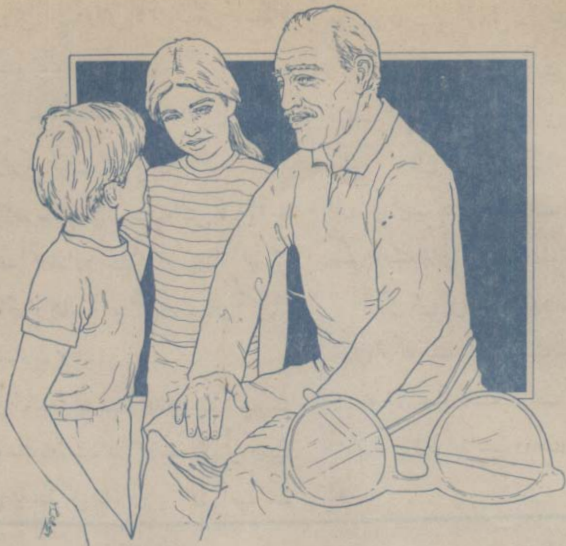

دوست

ثمرہ زیدی

"باجی...... باجی...... آج میرا دوست آرہا ہے۔ آپ اس سے ملیں گی تو بہت خوش ہونگی۔" عدنان نے بڑے پُرجوش لہجے میں باجی سے کہا۔

"مُنّے میاں! تمہارا دوست کیا لطیفے سُناتا ہے؟" باجی ہنس کر بولیں۔

"ارے لطیفے..... اسے تو بہت ساری چیزیں یاد ہیں، کہانیاں، نظمیں، مضامین معلومات سب کچھ یاد ہے اسے ...... بہت ذہین ہے وہ اور اس کی تربیت بھی بہت اچھی ہوئی ہے وہ بہت اچھی اچھی باتیں بتاتا ہے۔"

"اچھا تو پھر ہم اس سے ضرور ملیں گے......

"کیا نام ہے تمہارے دوست کا؟" امی جو الگ تھلگ بیٹھی کسی کتاب کا مطالعہ کر رہی تھیں بولیں اب وہ بھی عدنان کی باتوں میں دلچسپی لینے لگی تھیں۔

"اس کا نام......!!" عدنان نے کچھ دیر سوچا پھر کہا۔ "اس کا نام میں ابھی نہیں بتاؤں گا جب وہ

آئے گا تو خود ہی آپ کو اس کا نام پتا چل جائے گا اچھا تو میں اسے لے کر آتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر عدنان نے اپنی اسپورٹس سائیکل اُٹھائی اور بازار کی طرف چل پڑا۔

کچھ دیر بعد عدنان بازار سے واپس آیا تو اکیلا تھا۔ "ارے! تمہارا دوست کدھر ہے؟" ابو امی نے ایک ساتھ پوچھا۔ "یہ سُن کر عدنان مُسکرایا اور منہ سے کچھ نہ بولا۔

"لو بھئی! مابدولت نے تو جلدی سے آپ کے دوست کے لئے پکوڑے اور سموسے بھی تل دیئے اور اچھی سی چائے بھی بنا ڈالی اور آپ کے دوست غائب۔" باجی نے جلدی سے کہا۔

"اصل میں میرا دوست کچھ کھاتا پیتا نہیں ہے۔ آپ نے خواہ مخواہ اس کے لئے اتنا تکلف کیا۔" عدنان نے مُسکراتے ہوئے کہا پھر جیکٹ کی اندورنی جیب سے ایک کتاب نکال کر گھر والوں کے سامنے لہرائی تو سب لوگ حیران رہ گئے۔

"جی ہاں یہی ہے میرا دوست جو ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو مجھ سے ملنے آتا ہے۔"

عدنان نے بڑے فخر سے کہا اور جھٹ سے صوفے پر بیٹھ کر اپنے دوست سے باتیں کرنے لگا۔

☆ دوست میرے والدین ہیں ☆

سلمیٰ وحید

کراچی

روشنی ہوں میں، چراغ میرے والدین ہیں
موج ہوں میں، ساحل میرے والدین ہیں
کرن ہوں میں، سورج میرے والدین ہیں
تعبیر ہوں میں، خواب میرے والدین ہیں
محبّت ہوں میں، دوست میرے والدین ہیں
خوشبو ہوں میں، پھول میرے والدین ہیں
چاندنی ہوں میں، چاند میرے والدین ہیں
دُھن ہوں میں، نغمہ میرے والدین ہیں
قلم ہوں میں، نظم میرے والدین ہیں

سعدیہ یاسمین، راولپنڈی

اپنی دُنیا آپ پیدا کر

"ادھر آؤ نالائق!!" سلمان ڈرتے ڈرتے ابّو کے پاس پہنچا۔ ابّو نے چشمہ ناک سے اُتارا۔ ہاتھ میں پکڑی کتاب کو میز پر پھینکا اور آنکھوں کو ایک خاص زاویئے سے گھما کر غصّے سے بولے۔

"تمہاری بہت شکایتیں آرہی ہیں۔ سارا دن کرکٹ کھیلتے رہے ہو پڑھنے لکھنے کی کوئی فکر نہیں۔ گھر کا کوئی کام نہیں کرتے ہو۔ آخر تم چاہتے کیا ہو۔ اگر امتحان میں فیل ہوئے تو پھر وہ پٹائی کروں گا کہ زندگی بھر یاد رکھو گے۔" وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا پھر امتحان سر پر آگئے۔ جیسے تیسے کر کے سلمان نے امتحان دیا۔

اور جب رزلٹ آیا تو وہ فیل ہو چکا تھا۔ گھر پہنچا تو ابو جوتا لئے اس کے منتظر تھے۔ دھنا دھن وہ جوتے پڑے کہ دن میں تارے نظر آگئے۔ "کرکٹ کھیلو گے۔ عمران خان اور وسیم اکرم بنو گے۔ کینسر ہاسپٹل کے ٹکٹ فروخت کرو گے۔ کینسر ہاسپٹل بن جانے سے تمہیں کیا ملے گا؟ عمران خان کیا دے دے گا تمہیں؟ بے وقوف اپنے قیمتی وقت کو ضائع کر رہا ہے فضول کاموں میں ......" ابو کے آخری جملے سن کر سلمان کا ننھا سا دل تڑپ اُٹھا۔ پٹتے ہوئے اس نے خلاف معمول ابو کو جواب دیا۔

"ابّو! آپ مجھے گھٹیا کہہ لیں لیکن عمران خان کے کینسر ہاسپٹل کو بُرا مت کہیں۔

کل خدانخواستہ آپ بھی اس بیماری کے شکار ہوسکتے ہیں۔" یہ سُن کر تو ابّو کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ انہوں نے بُری طرح سلمان کو پیٹنا شروع کر دیا۔

سلمان روتا چوٹیں سہلاتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا اور بستر پر گر کر رونے لگا پھر روتے روتے نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

پھر وہ اسکول میں تھا جہاں رزلٹ سُنایا جا رہا تھا۔ میڈم نے اس کا نتیجہ سنایا۔ "سلمان! کلاس ہفتم۔ تمام مضامین میں زیرو۔ فیل!" یہ سُنتے ہی تمام بچوں نے زور سے تالیاں بجائیں اور اسکول میں اس کے فیل آنے پر بے حد خوشی ہوئی۔

سلمان خوشی سے اُچھلتا کودتا گھر پہنچا۔ "امّی ابّو دیکھیں تو میں فیل ہو گیا ہوں۔" گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے آواز لگائی۔ امّی نے یہ سُن کر اس کا منہ خوشی سے چُوم لیا جب کہ ابّو نے انعام میں سو کا نوٹ دیا اور اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔ "ہمارا بیٹا کتنا نالائق ہے۔ شاباش!!"

اتنے میں سلمان کا بھائی داخل ہوا۔ ابو نے اس کا رزلٹ کارڈ دیکھ کر چیختے ہوئے کہا "تم پھر فرسٹ آئے ہو!!" اور خوب مارا اچانک سلمان کو امی کی آواز سنائی دی۔ "بیٹا! خواب میں کس سے لڑ رہے ہو اٹھ جاؤ۔ تم نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا چلو آئندہ سال کے لئے محنت کر لینا۔ فیل ہونے کا غم نہ کرو۔" کھانا کھانے کے بعد ابو نے اسے اپنے کمرے میں بلوا لیا۔

"جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو" کا ورد کرتا وہ امی کے ہمراہ ابو کے کمرے پہنچا۔ پھر وہ حیران رہ گیا کیوں کہ ابو نے اسے گلے لگا لیا اور کہا "مجھے معاف کر دو بیٹا! میں نے تمہیں بہت مارا۔ اصل میں تمہاری پڑھائی پر توجہ ہی نہیں دی گئی اب میں تمہیں پڑھاؤں گا۔"

سلمان حیران تھا، لیکن اس کو جلد ہی پتہ چل گیا کہ ابّو کیوں پریشان ہیں؟ ہوا یوں کہ دادی جان بیمار تھیں ڈاکٹر نے ان کے ٹیسٹ لئے تھے جس میں پتہ چلا تھا کہ دادی کو کینسر ہے۔ سلمان یہ سُن کر بہت اُداس ہوا۔ لیکن جب ابّو نے اس کو کینسر ہاسپٹل کے لئے پیسے پکڑائے تو سلمان کو کچھ اُمید ہو گئی۔

.... کہ شاید اس طرح میری یا کسی اور کی دادی جان بھی بچ سکتی ہے۔ اور شام کو جب ابّو اس کو پڑھا رہے تھے تو سلمان کو ابو سچ مچ بہت پیارے لگ رہے تھے۔ شفیق سے نرم دل سے۔ وہ خوب دھیان اور توجّہ سے پڑھ رہا تھا۔ اسے اپنی چوٹوں کی تکلیف کا بھی کوئی احساس نہ تھا۔ اس نے دل میں پکّا ارادہ کر لیا تھا کہ اب وہ امتحان میں کبھی فیل نہیں ہو گا۔

میں ننّھا سا بچّہ ابو بنوں گا

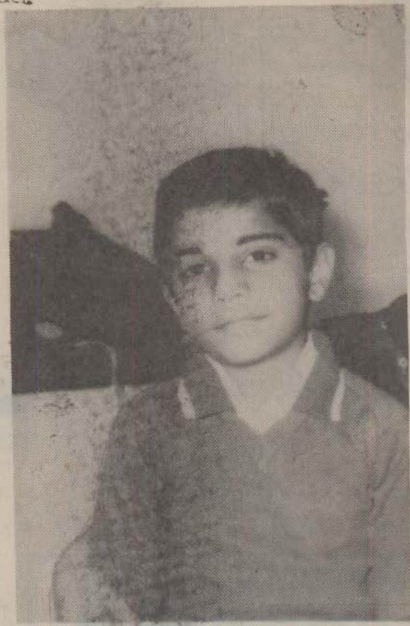

عجب گھڑی تھی
کاپی ٹیبل پہ پڑی تھی
اور مجھے ہوش ہی نہ رہا تھا
کہ جو کام محنت سے کیا ہے
سب ادھورا رہ گیا ہے
امی نے کہہ دیا ہے
کل تمہیں کام پہ جانا ہو گا
کما کے ہمارے لئے کچھ لانا ہو گا
کتاب کی جگہ
ہاتھ میں ٹفن کیریئر اب میں تھاموں گا
صبح ہی صبح بسوں کے پیچھے بھاگوں گا
مجھے معلوم ہے
اب یہ کاپی ٹیبل پہ پڑی ہی رہے گی
میرا بستہ میرا چہرہ تکتا رہے گا
میں ننّھا سا بچّہ
ابّو بنوں گا
کہ ابّو میرے کل مر گئے ہیں....!!!

مصروف تھے تو بارشیں بے رنگ سی لگیں

فرصت ملی تو توس قزح ڈھونڈتے رہے

مرسلہ ...... سید محمد اسامہ، راولپنڈی

ایک ننھی سی کہانی

ننّے بچّوں کے لئے

چوں چوں اب اُداس نہیں

حرا ہاشمی، کراچی

چوں چوں چڑیا کو باغ کے پرندوں نے دھکے دے کر باغ سے نکال دیا۔ کہنے لگے۔ "تمہاری آواز تو اچھی ہے پر تم بہت کالی ہو۔" آہ! یہ سُن کر چوں چوں کا ننھا منّا سا دل ٹوٹ گیا۔

وہ دوسرے باغ میں چلی گئی.... مانو کے باغ میں اور ڈالی پر بیٹھ کر ایک غم زدہ گیت گانے لگی:

دنیا گوری چوں چوں کالی
پھرتی ہے وہ ماری ماری

گیت ختم ہوا اور چوں چوں رونے لگی۔

"ٹپ ....ٹپ......ٹپ......ٹپ !!" ایک موٹا گرم گرم سا آنسو مانو کی کمر پر گرا۔ مانو تڑپ اُٹھی۔ گردن اٹھا کر بولی۔ "یہ دنیا اچھوں ہی کو بُرا کہتی ہے تم اُداس کیوں ہوتی ہو تمہیں تو خوش ہونا چاہئے کہ تم اچھی ہو.....اور.....اور اچھے لوگ ہی سچے دوست ہوتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے مانو نے چوں چوں کے آنسو پونچھ دیئے اور اس سے دوستی کرلی۔

اچھے لوگ ہی ہمیشہ دوسروں کا درد محسوس کرتے ہیں!!

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا روشن ہے بجلی کے چراغوں سے

مرسلہ...... فیصل احمد شجراہ، کنڈ کوٹ

ون ڈے

نظم

ننھے کرکٹرز کے لئے ایک نظم

آؤ بچّو مل کر کھیلیں ہم سب ون ڈے کرکٹ میچ
منّو کی ہے بالنگ اچھی، چنّو کا ہے اچھا کیچ
بچّو ہم میدان میں جاکر میچ مزے سے کھیلیں گے
لوگ بہت سے آئیں گے اور کھیل ہمارا دیکھیں گے
مارے گا جب کوئی چھکّا، بچّے شور مچائیں گے
میچ میں وقفہ آئے گا تو اچھی چیزیں کھائیں گے
ون ڈے کرکٹ میچ میں بچّو ایک یہ خوبی ہوتی ہے
جلد نتیجہ آتا ہے اور دلچسپی بھی ہوتی ہے

اس طرح تو ہوتا ہے

چوتھا ٹکڑا

محمد اجمل
انصاری
کراچی

سی این این کی رپورٹ سے پتا چلا کہ نامعلوم سیارے کی مخلوق نے ہمارے وطن اندھیر نگری چوپٹ راج پر قبضہ کر لیا ہے اور ملک کا مکمل نظم و نسق سنبھال لیا ہے۔ ہمارے ملک کی فوج پہلے آریکا کی نگرانی میں کام کر رہی تھی اب سیارے کی مخلوق کی ماتحت بن گئی اور رہ گئے بے چارے عوام تو وہ دال روٹی میں اتنے اُلجھا دیئے گئے تھے کہ انہیں کچھ پتا ہی نہ تھا کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے اور کس کے حکم پر ہو رہا ہے؟

"تم ابھی تک ٹی وی دیکھ رہے ہو جاؤ بیکری سے ڈبل روٹی لے آؤ۔" امی جان بولیں۔ "جی اچھا۔" میں نے جلدی جلدی منہ پر پانی کے دو چار چھینٹے مارے اور بغیر ٹوتھ پیسٹ کے پیسے جیب میں ڈال کر بیکری جانے کے لئے گھر سے باہر نکل آیا۔ ٹوتھ پیسٹ نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہی ٹوتھ پیسٹ جو پچاس روپے کا آتا تھا اب سو روپے کا ہو گیا تھا اس لئے گھر میں اب سب لوگ نمک سے دانت مانجھتے تھے حالانکہ نمک بھی کوئی سستا نہیں تھا۔ جتنے میں چینی آتی تھی اس سے کچھ کم میں آتا تھا۔

میں بیکری پر پہنچا تو دکان دار نے کہا "بیس

روپے اور دو۔"

"وہ کس بات کے؟" میں نے پوچھا۔

"ڈبل روٹی کے!" اس نے کہا۔

"تو کیا اب تیس روپے والی ڈبل روٹی پچاس روپے میں ملے گی؟" میرے لہجے میں حیرانگی سے زیادہ بیچارگی تھی۔

"ابھی تو دیکھتے جاؤ...... آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا...... ابھی تو اور مہنگائی ہوگی اب تو خلائی مخلوق نے بھی قبضہ کر لیا ہے ہمارے ملک پر۔ وہ لوگ بھی حکمرانوں کی طرح ہماری کھال کھینچیں گے۔" دکان دار نے اپنے پیلے پیلے دانت نکالے۔

"اف!" اس کے پیلے پیلے دانت دیکھ کر تو مجھے گھن ہی آ گئی۔ "کیوں کیا آپ دانت نہیں مانجھتے ہیں؟" میری بات سن کر وہ ڈھٹائی سے ہنسا اور ہنس کر بولا۔ "غریب آدمی ہوں ...... منجن اور ٹوتھ پیسٹ کے لئے پیسوں کا ضیاع نہیں کر سکتا۔" اس کی بات میں خاصا وزن تھا خیر میں نے ناک پر ایک ہاتھ رکھا اس سے ڈبل روٹی لی اور جلدی سے بیکری سے واپس پلٹ پڑا کہ کہیں وہ دس روپے اور زیادہ نہ مانگ لے۔

'لے آئے ڈبل روٹی؟" آپا نے پوچھا۔

سب لوگ منہ ہاتھ دھو کر میز کے گرد بیٹھے تھے اور ڈبل روٹی کا انتظار کر رہے تھے۔ "جی ہاں پچاس روپے کی ملی ہے۔" میں نے ڈبل روٹی میز پر پٹخ دی لیکن کسی نے احتجاج تک نہ کیا بلکہ سر جھکا کر ناشتے میں مصروف ہو گئے۔

"مہنگائی کبھی ختم ہو ہی نہیں ہو سکتی کیوں کہ جب بھی مہنگائی ہوتی ہے کوئی اس کے خلاف احتجاج نہیں کرتا ہے۔" میری بات سن کر ابو نے ڈبل روٹی کا لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"خاموشی سے ناشتہ کرو اس ملک میں اچھے لوگوں کی بات نہیں سنی جاتی۔" مجھے بہت غصہ آ رہا تھا لیکن یہ سوچ کر کہ اسلام میں غصہ حرام ہے میں نے چائے کے ساتھ غصے کو بھی پی لیا۔

میں شام میں بازار گیا تو وہاں لوگوں میں بے چینی پھیلی تھی۔ لوگ چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ دکانداروں نے صورتحال کو بدلتا دیکھ کر چیزوں کی قیمتوں میں اچانک من مانا اضافہ کر دیا تھا لیکن شام سات بجے کی خبروں کے بعد صورتحال ہی بدل گئی۔ خلائی مخلوق کے کمانڈر نے ایک نیا حکم نامہ جاری کر دیا جسے سُنتے ہی پورے ملک میں لوگوں کے چہرے خوشی سے کِھل اُٹھے۔ چیزوں کی قیمتیں حد درجہ گرا دی گئی تھیں۔ لوگوں کی خاموش اکثریت پہلی بار خوشی کے اظہار میں گلیوں اور سڑکوں پر نکل آئی۔ فضا نعروں سے گونج اٹھی تھی:

"خلائی مخلوق زندہ باد............ مہنگائی مردہ باد ...... ظالم حکمران مردہ...... ظالم حکمران مردہ باد......
خلائی مخلوق زندہ باد۔"

خلائی مخلوق کے کمانڈر انچیف نے ٹی وی پر قوم سے خطاب کیا ان کی زبان چینی زبان سے ملتی جلتی تھی۔ ظاہر بھگوڑی کے والد جناب عبدالمجید صاحب

نے اس کا ترجمہ ٹی وی پر پڑھ کر سنایا (خلائی مخلوق کے کمانڈر نے انہیں اپنا خصوصی مشیر مقرر کیا تھا)

دوسرے دن اخبارات چٹ پٹی مصالحے دار خبروں سے بھرے پڑے تھے۔ خلائی پولیس کے سپاہیوں نے مہنگی اشیا فروخت کرنے والے، ملاوٹ کرنے والے، رشوت لینے والے، ذخیرہ اندوزی کرنے والےاور دہشت گردی پھیلانے والے ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو گرفتار کر لیا تھا۔ ایک تصویر میں ایک موٹا سا قصاب چیخیں مارتا ہوانظر آ رہا تھا۔ ایک خلائی سپائی اسی کی چھری سے اس کے بازو کا گوشت کاٹ رہا تھا۔ تصویر کے نیچے تفصیل تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ یہ قصاب گاہکوں کو گوشت کم تول کر دیتا تھا۔ ایک گاہک کو آدھا پاؤ گوشت کم تول کر دے رہا تھا اسی وقت خلائی سپاہیوں نے چھاپہ مار کر اسے رنگے ہاتھوں پکڑا اور اس کے بازو سے آدھا پاؤ گوشت کم کر دیا۔

اس خبر کو پڑھتے ہی میں خوشی سے اُچھل پڑا دل چاہ رہا تھا کہ میں بھی خلائی سپاہیوں کے ساتھ شامل ہو جاؤں۔ (جاری ہے)

عجب دن تھے وہ بچپن کے

مرسلہ...... شبنم سلیمان، کراچی

کتنی اچھی لگتی ہیں
بچپن کی وہ سب باتیں
بے فکری میں ڈوبے دن
میٹھی نیندوں کی راتیں
بے ضرر سے جھگڑے تھے
بے موسم کی برساتیں
وقت نے لیکن سب کچھ اب
ہم سے آ کر چھین لیا ہے
چھوٹی چھوٹی فکروں نے
ہم کو آ کر گھیر لیا ہے

مظلوم کی بد دعا سے ڈرو کیونکہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں۔

- میٹھے بول میں جادو ہے۔
- دولت کے بھوکے کو کبھی راحت نہیں ملتی۔
- پختہ ارادہ کامیابی کی ضمانت ہے۔
- انسان اپنی زبان کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔

مرسلہ جواہر عرف جیرام داس، کندھ کوٹ

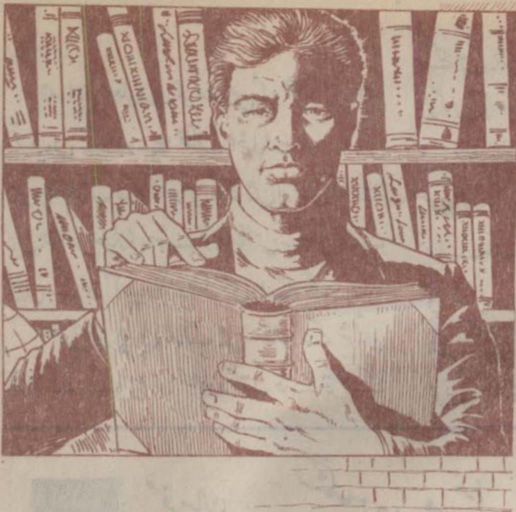

کتب خانوں کی اہمیت اور افادیت

سید شمیم احمد زیدی، کراچی

کسی بھی ملک کے طلبا و طالبات اور وہاں کے لوگوں کی تعمیری ترقی میں اس ملک کے کتب خانوں کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔

کتب خانوں میں موجود نادر کتابیں نہ صرف طلبا کی تعمیری ترقی کرتی ہیں بلکہ طلبا کو ذہنی اور روحانی آسودگی بہم پہنچانے میں بھی بڑی مدد گار ثابت ہوتی ہیں۔ ان کتب خانوں میں قومی اور بین الاقوامی ایوارڈ یافتہ شاعروں، ادیبوں، اسکالروں اور دوسرے مشہور و معروف لوگوں کی تصنیف شدہ کتابیں موجود ہوتی ہیں جن کا مطالعہ کر کے ایک طرف تو ہم ان کے انداز فکر سے آشنا ہوتے ہیں تو دوسری طرف ان کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ہر آدمی اپنی تھکن کو اترتا ہوا محسوس کرتا ہے۔

کتب خانے، دلچسپی اور معلومات کا ایک خزانہ ہیں جہاں پر مذہبی، سائنسی، اصلاحی، ادبی اور رومانی کتابیں موجود ہوتی ہیں۔ ہر شخص اپنی طبیعت اور ماحول کے اعتبار سے کتب کا انتخاب کرتا ہے۔

ان کتابوں کے مطالعے سے ایک طرف تو انسان کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے تو دوسری طرف اس میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اگر ایک بہت ہی بیمار اور غمگین شخص کو، جس کا دل کسی بھی دنیاوی شے سے نہ بہل رہا ہو اس کو اگر ایک عدد دلچسپ کتاب دے دی جائے تو اس کا چہرہ کھل اٹھے گا۔ کتابیں.... ایسی بند کلی ہوتی ہیں کہ ان کو اگر کھولا جائے تو ان کی بھینی بھینی خوشبو سے انسان کا دماغ معطر ہو جاتا ہے۔

کتابوں کے مطالعے سے بڑے فائدے حاصل ہوتے ہیں ایک یہ کہ معلومات میں اضافہ ہوتا ہے دوسرے یہ کہ یہ ایک صاف ستھرا شغل ہے اور ان کے مطالعے سے خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوتا

ہے۔

ہم اپنی معلومات کو مضامین کی شکل میں اپنی تحریروں کے ذریعے مختلف اخبارات اور رسائل میں بزم ادب کے مخصوص صفحے میں ارسال کر سکتے ہیں جو اگر معیاری ہوئے تو یقیناً اس صفحے کی زینت بنیں گے اور آپ کا حوصلہ بھی بڑھے گا۔

مغربی اور یورپی ممالک میں مطالعہ کے شوقین افراد کے لئے وسیع اور کشادہ کتب خانے قائم کئے گئے ہیں جہاں پر معیاری کتابوں کی ایک کثیر تعداد لوگوں کو مہیا کی گئی ہے۔

ہمارے ملک پاکستان میں کتب خانوں کی کمی ہے اور وافر مقدار میں سہولتیں مہیا نہیں ہیں اگر ہمارے ملک میں بھی حکومت مغربی اور یورپی ممالک کی طرح زیادہ سے کتب خانے قائم کرے تو کچھ شک نہیں کہ ہمارا آج کا طالب علم کل کا کوئی ادیب یا اسکالر بن جائے۔

سنگین مسئلہ

فرسان
احمد خان غوری

کچھ ہاتھوں میں آج اسلحہ ہے
سنگین بہت یہ مسئلہ ہے

اچھا تو نہیں یہ کام دیکھو
اسلحے والا بدنام دیکھو

سناٹا کھڑا ہے بھوت جیسا
ہنگامہ بھی ہے سکوت جیسا

رکھو نہ کبھی یہ اسلحہ ہے
سنگین بہت یہ مسئلہ ہے

آتے جاتے

○ — جو شخص زبان کی حفاظت کا ذمہ لے لے۔ میں اس کے لئے جنّت کا ذمہ لیتا ہوں۔ (حضورؐ)
○ — زبان وہ درندہ ہے کہ چھوڑ دو تو کاٹ کھائے۔ (حضرت علیؓ)
○ — زبان کی لغزش قدموں کی لغزش سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ (حضرت عثمانؓ)

مرسلہ : محمد اظہر خان

○ ...... حیا ایمان کی ایک شاخ ہے۔
○ ...... سچ بولو! خواہ کسی کو ناگوار گزرے۔
○ ...... اللہ سے ڈرو تا کہ دوسروں کا خوف نہ رہے۔
○ ...... بندوں کی خدمت کرنا بھی عبادت ہے۔

مرسلہ : عمران رشید

○ — رینگنے کی ساری زندگی سے صرف ایک لمحہ پرواز کا بہتر ہے۔
○ — انسان کا بڑا پن اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب وہ دوسروں کی خوشیوں کی خاطر اپنی خوشیاں قربان کر دیتا ہے۔

مرسلہ : رضوان بن ستار

○ — سب سے موثر واعظ یہ ہے کہ انسان قبرستان کو دیکھ کر عبرت حاصل کرے۔
○ — نیکی کی منزل اس کو ملتی ہے جو گناہوں کی وادی سے دامن بچاتا ہوا نکل جائے۔

مرسلہ : محمد ابراہیم

○ دستر خوان پر دیر سے جایئے اور جلد از جلد واپس آ جایئے۔
تمام بیوقوفیاں، عقلمندیاں سمجھ کر کی جاتی ہے۔
○ اگر بڑے کام نہیں کر سکتے تو چھوٹے، کام بڑے انداز میں کریں۔

مرسلہ: مولابخش

○ گلے اور شکوے سے زبان بند رکھو۔ راحت نصیب ہوگی۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ
○ اگر تندرست رہنا چاہتے ہو تو نیک بنو۔ نیک بننا چاہتے تو دانا بننے کی کوشش کرو۔ دانا بننا چاہتے ہو تو مذہب کا مطالعہ کرو۔ ابو بکر بن داوٗدؒ

مرسلہ ...... غلام مصطفیٰ شجراہ، جیکب آباد

○ — بد ترین شخص وہ ہے جو توبہ کی امید ہر گناہ پر کرے۔
(خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ)
○ — حکمران دنیا اور آخرت میں سب سے زیادہ بد بخت ہوتے ہیں۔
(حضرت ابو بکر صدیقؓ)

مرسلہ...... عمران عزیز، ماتلی

دو دوست

شمع انعام

اکڑ بکڑ تھے دو یار　　گھر سے نکلے وہ اک بار
بھول بھلکڑ تھے دونوں　　جانا ان کو تھا بازار
سوچا جا کر لائیں گے　　آلو گوبھی اور انار
پیسے لینا بھول گئے　　جا کر بس میں ہوئے سوار
بس میں گرمی خاصی تھی　　اس پر لوگوں کی بھرمار
پاس آیا جب کنڈیکٹر　　تب چونکے وہ دونوں یار
"ٹکٹیں لے لو جلدی سے"　　کنڈیکٹر کا تھا اصرار
ساری جیبیں خالی تھیں　　پاس نہیں تھے آنے چار
اب تو دونوں گھبرائے　　حُجّت کرنا تھا بے کار
غصے میں تھا کنڈیکٹر　　لڑنے مرنے پر تیار
پکڑی گردن دونوں کی　　ان کو بس سے دیا اُتار

واپس اپنے گھر آئے
پیدل چل کر دونوں یار

نوٹس بورڈ

مقابلوں کے نتائج اور ضروری اعلانات نوٹس بورڈ پر درج کیے جائیں گے۔
ہر مقابلے میں شرکت کے لیے کوپن روانہ کرنا ضروری ہے۔
کوپن صفحہ نمبر ۱۲۸ پر ملاحظہ فرمائیے۔

مئی ۹۵ء کے خاص نمبر سے قلمی دوستی کا ایک نیا سلسلہ "ہیرو کے مہمان" کے عنوان سے شروع کیا جا رہا ہے۔ اس میں ایسے بچوں کا تعارف اور تصاویر شائع کی جائیں گی جو اس ماہ میں پیدا ہوئے ہوں۔ ادارہ آنکھ مچولی کے علاوہ اُسی مہینے میں پیدا ہونے والے کوئی قومی ہیرو بھی بچوں کے میزبان ہوں گے۔ اپنے تعارف اور شناختی کارڈ سائز بلیک اینڈ وہائٹ تصویر کوپن کے ہمراہ آج ہی روانہ کر دیجیے۔

آپ کے ایسے دوست جو آنکھ مچولی پڑھنا چاہتے ہوں لیکن اسے خریدنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں، آپ انہیں آنکھ مچولی کا تحفہ مفت پیش کر سکتے ہیں آپ ان کا نام اور پتا کوپن میں لکھ کر ہمیں بھیج دیجیے ——— ادارہ ان میں سے بذریعہ قرعہ اندازی دس ساتھیوں کو اپنا ممبر بنالے گا اور انہیں ایک سال کے لیے آنکھ مچولی مفت جاری کر دیا جائے گا۔ اس طرح آپ ایک نیک کام کریں گے اور ادارہ آنکھ مچولی کو بھی ایک نیک کام کرنے کا موقع فراہم کریں گے۔

کوپن برائے "سالانہ خریداری"

نام ______

مہینہ جس سے رسالہ شروع کروانا چاہتے ہیں ______

رقم ______ بذریعہ ______

پتا ______

فون نمبر ______

کوپن برائے "ہیرو کے مہمان"

نام ______ تاریخ پیدائش ______ جماعت ______

تعلیمی ادارہ ______ مشغلہ ______

پتا ______

______

کوپن برائے "تحفہ آنکھ مچولی"

میرے دوست کا نام ______

جماعت ______

گھر کا پتا ______

______

کوپن برائے "سب سے بہترین"

سب سے اچھی کہانی ______ مُصنّف ______

سب سے اچھی نظم ______ شاعر ______

بھیجنے والے کا نام اور پتا ______

______

پیغام

اے رات مجھے ماں کی طرح گود میں لے لے
دن بھر کی مشقت سے بدن ٹوٹ رہا ہے

مرسلہ ..... کنور واجد حسین، دھنوٹ

اِفلاس نے بچوں کو کبھی سنجیدگی بخشی
سہمے ہوئے رہتے ہیں شرارت نہیں کرتے

مرسلہ ..... ظہیر احمد، کراچی

ایک مدت سے میری ماں نہیں سوئی تابش
میں نے اک بار کہا تھا مجھے ڈر لگتا ہے

مرسلہ ..... ثمینہ جمیل، کراچی

میں کون ہوں؟

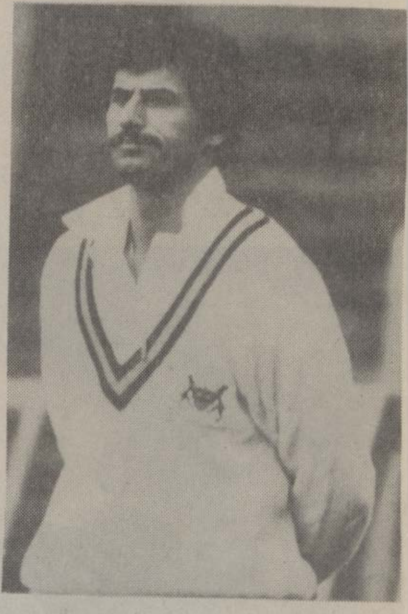

یہ تصویر ایک مشہور شخصیت کی ہے آپ کو اس کا نام اور کس حوالے سے یہ شخصیت مشہور ہے۔ بتانا ہے۔ چھ درست جواب ارسال کرنے والے ساتھیوں کو آنکھ مچولی کا تازہ شمارہ مفت ارسال کیا جائے گا۔ حل زیادہ ہوئے تو فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی ہوگا۔ جوابات ، راپریل تک ارسال کیجیے

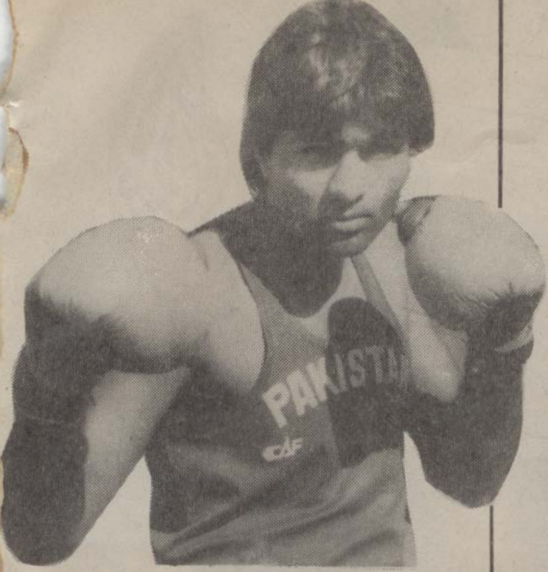

فروری کے شمارے میں جس شخصیت کی بچپن کی تصویر شائع کی گئی وہ تھے پاکستان کے مشہور باکسر محمد حسین شاہ انہوں نے اولمپک گیمز میں پاکستان کو کانسی کا تمغہ دلوایا تھا

..... ہمیں سینکڑوں ساتھیوں کے درست جوابات موصول ہوئے ..... چھ خوش نصیب ساتھی جو قرعہ اندازی کے ذریعے انعام کے حقدار قرار پائے درج ذیل ہیں:

عائشہ گل ، زبیر احمد خان ، شہریار گل ، محمد اشرف گھانچی ، عشرت یوسف ، اسمٰعیل عبدالرحمان ۔

فرحت، ٹھنڈک
اور تازگی کے ساتھ....
واہ! کیا مزہ
QUICE
MANGO DRINK
کوئس
شراب آئس کریم
QUICE
VIMTO DRINK
کوئس
ٹیٹرا پیک
ڈرنکس
مینگو جوس اور دو منفرد ذائقے۔ آئس کریم۔ وِمٹو
کوئس فوڈ انڈسٹریز لمیٹڈ
11/139 جمال الدین افغانی روڈ۔ شرف آباد نزد بہادر آباد
پوسٹ بکس نمبر 8026 کراچی 74800 (پاکستان)
ٹیلیفون: 4933061 4944529
Transworld

REGD. No. M-266 APRIL 1995
MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI